اگست ۲۰۰۴ء

# ماہنامہ شعاع عمل لکھنؤ

موسسۂ نور ہدایت حسینیۂ غفران مآبؒ لکھنؤ-۳

Monthly

# SHUA-E-AMAL

Lucknow

# शुआ-ए-अमल

हिन्दी, उर्दू मासिक पत्रिका

लखनऊ

**NOOR-E-HIDAYAT FOUNDATION**

Imambara Ghufran Maab, Chowk

LUCKNOW-3 (U.P.) INDIA

Phone : 2252230

# فہرست مضامین

اگست ۲۰۰۴ء



## منظومات

# سخنان

نیا شمارہ جن ایام پر محیط ہے ان میں ۲۰ ر جمادی الثانی خاتون جنت بضعۃ الرسول بتول عذرا انسیہ حورا سیدۃ نساء العالمین حضرت فاطمۃ الزہراء صلوٰۃ اللہ علیہا کی ولادت باسعادت کی تاریخ ہے۔ آپ کی سیرت طیبہ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس لئے کہ طبقۂ خواتین کے لئے آپ ہی کی ذات مبارکہ نمونۂ عمل ہے خوش قسمت اور لائق مبارکباد ہیں وہ عورتیں جو سیدۂ عالمیان کی حیات ہدایت آموز کی پیروی کر کے صحتمند و خوش اخلاق معاشرہ تشکیل دینے میں مصروف ہیں۔

---

یکم رجب المرجب کو امام خامس باقر علم النبیین حضرت محمد باقر علیہ السلام کی عید میلاد ہے۔ نشر علوم محمدؐ آپ کا عظیم کارنامہ ہے آپ کی ذات حمیدہ صفات ''و الفضل ماشھدبہ الاعداء'' کی مصداق تھی۔ دشمن بھی آپ کی جلالت علمی و عظمت کردار کے معترف تھے۔ آپ عالم طفلی میں بھی جب مظالم کے پہاڑ آپ اور آپ کے خانوادہ اور دوسرے حق پرست افراد پر توڑے جارہے تھے، ظلم و ستم سے خوفزدہ نہیں ہوئے بلکہ ہمت شکن حالات میں بھی سلطان جابر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جو گفتگو کی اس نے جبر و بربریت کے بھرے دربار میں محمدی کردار اور علوی جرأت اظہار کی وہ مثال قائم کی جو ہمیشہ فرزندان توحید و جانبازان اسلام کے لئے مشعل راہ رہے گی۔

---

پنجم رجب المرجب امام عاشر حضرت علی نقی علیہ السلام کی ولادت اور ۳ ر رجب شہادت امام کی تاریخ ہے۔ آپ کی زندگی بھی مصائب و مظالم کے حصار میں رہی مگر آپ نے بھی راہ بشریت کو اطاعت و عبادت، شفقت و رحمت، ضبط و تحمل صبر و رضا کے چراغوں سے ایسا روشن کر دیا کہ آج بھی حق طلب و حق شناس انسان اپنے سفر زندگی میں اسی نورانیت کردار سے مستفیض ہو کر اپنے کو دین کی نظر میں سچا اور دنیا کی نظر میں اچھا بنا سکتا ہے۔

---

اور دہم رجب المرجب امام تاسع حضرت محمد تقی علیہ السلام کا یوم پیدائش ہے۔ آپ بھی علم و عمل کے مخزن، تشنگان علوم کے مرجع، یتیموں اور مسکینوں کے ملجا و ماویٰ اور اللہ کے نمائندۂ برحق تھے۔ تاریخ آج بھی اپنی زبان میں امام کی علمی بلندی و حکمت عملی کا قصیدہ پڑھ رہی ہے کہ ایک زمانے کی نظر میں بچہ زمانے کے بڑے بڑے علماء کے سر خدا کی دی ہوئی بڑائی کے سامنے جھکوا کر سچے جانشین رسولؐ کی طرف اذہان کو متوجہ کر دیتا ہے۔

---

معصومین علیہم السلام کا دراصل وہی چاہنے والا ہے جو جھوٹ سے دور رہے اور سچ کا ساتھ دے۔ افسوس ہے کہ آج کل نام نہاد عقیدہ دار لوگ اخبار کے مراسلوں میں اپنے مکر و زور، کینہ و عناد، فتور و حسد کے تحت اپنی بدباطنی اور کج نظری کا مستقل ثبوت فراہم کرتے رہتے ہیں لگتا ہے جیسے جھوٹ کے پل باندھنا ان کا اور چلمن کے پیچھے بیٹھے ان کے آقاؤں کا پرانا پیشہ

ہے۔شیعہ کالج کی تعمیر وتاسیس کے حقائق وحالات سے ناواقف افراد آئے دن اپنی بے سوادی یا مکاری کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں شیعہ کالج کے موسسین کی ایک فہرست ہے لیکن علماء میں سوا آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے بانی قدوۃ العلماء آیۃ اللہ العظمیٰ سید آقا حسن نقوی طاب ثراہ اور سید الادباء خطیب اعظم مولانا سید سبط حسن نقوی فاطرآعلی اللہ مقامہ کوئی تیسری ذات نہیں ہے البتہ روساء افراد کئی عدد ہیں جو موسسین وبانیان کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً نواب رامپور جناب حامد علی خانصاحب، حاجی نواب سر فتح علی خاں رئیس لاہور وتعلقدار نوابگنج علی آباد (بہرائچ) وغیرھم ــــــــ ذاکر شام غریباں عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین نقوی مجتہد نے اجلاس چہل آل انڈیا شیعہ کانفرنس منعقدہ ۲۸، ۲۹ر دسمبر ۱۹۵۵ء بمقام میرٹھ اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ'' آج میں جس کانفرنس کے فرائض صدارت انجام دینے کے واسطے حاضر ہوا ہوں اس کانفرنس نے اور میں نے ایک ہی آغوش میں پرورش پائی۔منزل تربیت ایک تھی، مرکز نشوونما ایک تھا یعنی میرے والد مرحوم حضرت قدوۃ العلماء مولانا سید آقا حسن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ نے ۱۹۰۷ء میں اس کانفرنس کی بنیاد رکھی۔'' اثنائے تقریر عمدۃ العلماء نے فرمایا اس کانفرنس نے عالم رنگ وبو میں آنکھ کھولتے ہی دینی ودنیاوی میدان میں عملی اقدامات شروع کردیئے۔واعظین ومبلغین معین کئے گئے جو تمام ہندوستان میں دورہ کرکے قوم کی دینی ودنیاوی خدمات انجام دیں۔دارالتالیف اور دارالترجمہ قائم کیا گیا۔شیعوں کی اقتصادی اصلاح کے پروگرام بنائے گئے۔شیعہ شوگر فیکٹری کا افتتاح کیا گیا۔ابتدائی تعلیم کا مدرسہ قائم کیا گیا۔دارالمطالعہ کھولا گیا۔طلبہ کے وظائف جاری کرنے کی تحریک پیش ہوئی اور وظائف دیئے گئے۔یتیم خانہ بھی اسی دور کی بنیاد ہے اور شیعہ کالج جو آج مچل مچل کے آغوش مادر سے باہر نکلنا چاہتا ہے وہ بھی اسی ایک اصل کی فرع ہے ان میں سے بعض چیزیں خدا کے فضل سے اب تک موجود ہیں اور بعض ختم ہوگئیں۔''

درمیان تقریر شیعہ کالج کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''اگر چہ یہ کالج شیعہ کانفرنس سے دامن کش ہے اور اپنے کو کانفرنس کا ماتحت نہیں سمجھتا یہاں تک کہ کانفرنس کے جلسہ میں اپنی سالانہ رپورٹ بھی نہیں پیش کرتا لیکن ماں باپ کو جو محبت اولاد سے ہوتی ہے وہ محبت اولاد کو ماں باپ سے نہیں ہوتی اس لئے شیعہ کالج شیعہ کانفرنس سے کتنا ہی بےفکر کیوں نہ رہے لیکن کانفرنس تو اس کی خیر اندیش ہی رہے گی اس لئے ضروری ہے جہاں ہم اس جلسہ میں اور تمام چیزوں پر غور کریں وہاں شیعہ کالج سے بھی بےفکر نہ رہیں۔''

مولانا سید محمد حسین صاحب نوگانوی طاب ثراہ تذکرۂ بے بہا فی تاریخ العلماء میں صفحہ ۶۰ پر قمطراز ہیں کہ ''۱۳۱۹ھ میں آپ (قدوۃ العلماء) نے انجمن صدر الصدور قائم کی جو ۱۳۲۳ھ میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے نام سے مشہور ہوگئی اور اسی کانفرنس کے اجلاس ہشتم میں شیعہ کالج کا بیڑہ اٹھایا گیا اور اسی کے چندہ کے لئے آپ (قدوۃ العلماء) اور نواب سر فتح علی خاں رئیس لاہور وجنرل سکریٹری کانفرنس (مولانا سید علی غضنفر اجتہادی) جانسٹھ تشریف لائے۔'' مولانا نوگانوی صاحب کا بیان کافی حد تک نتیجہ خیز اور فیصلہ کن ہے۔

آخر میں مستفیضان ''شعاع عمل'' سے درخواست ہے کہ وہ دیگر حضرات کو بھی ماہنامہ کا ممبر بنائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ مومنین کرام علمی وتحقیقی مضامین سے مستفید ہوسکیں۔

(ادارہ)

# قرآن شناسی　مسلمانوں کے درمیان قرآن کی کیا اہمیت ہے؟

فیلسوف اسلام علامہ سید محمد حسین طباطبائیؒ

ترجمہ: جناب ڈاکٹر چوہدری صاحب

### الف ۔قرآن مجید انسانی زندگی کے مجموعی پروگرام کی ضمانت دیتا ہے۔

چونکہ دین اسلام جو ہر دوسرے دین ومذہب سے بڑھ کر انسانی زندگی کی سعادت اور خوشحالی کی ضمانت دیتا ہے قرآن مجید کے ذریعے ہی مسلمانوں تک پہنچا ہے اسی طرح اسلام کے دینی اصول جو ایمانی، اعتقادی، اخلاقی اور عملی قوانین کی کڑیاں ہیں، ان سب کی بنیاد قرآن مجید میں موجود ہے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :انَّ ھٰذاالقرآن یھدی لِلّتی ھی اقوم (بنی اسرائیل ۔۹) ترجمہ: ''اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب قرآن مجید اس راہ کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی ہے ۔'' اور پھر فرماتا ہے :و نزّلنا علیک الکتٰب تبیانا لکل شی (نحل ۸۹) ترجمہ: اور ہم نے تم پر کتاب (قرآن) نازل کی جو ہر چیز کو واضح طور پر بیان کرتی ہے اور اس پر روشنی ڈالتی ہے۔

پس واضح ہے کہ قرآن مجید میں دینی عقائد کے اصول، اخلاقی فضائل اور عملی قوانین کا مجموعہ بہت زیادہ آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ ان آیتوں کو یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

**دوسرا مفصل بیان:** مندرجہ بالا چند تفصیلات میں غور کرنے کے بعد انسانی زندگی کے پروگراموں پر مبنی جو قرآن مجید میں لکھے ہوئے ہیں، ان کے حقیقی معنی کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

ا۔انسان اپنی زندگی میں کامیابی ، خوشحالی اور سعادت کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں رکھتا (خوشحالی اور سعادت ،زندگی کی ایک ایسی صورت ہے کہ انسان ہمیشہ اس کی خواہش اور آرزو رکھتا ہے مثلاً آزادی، فلاح و بہبود اور ذریعۂ معاش میں زیادتی وغیرہ)

اور کبھی کبھی ایسے اشخاص بھی نظر آتے ہیں جو اپنی سعادت اور خوشحالی کو نظر انداز کر دیتے ہیں ، مثلاً بعض اوقات ایک شخص خودکشی کر کے اپنی زندگی کو ختم کر لیتا ہے یا زندگی کی دوسری لذتوں سے چشم پوشی کر لیتا ہے، اگر ایسے اشخاص کی روحی حالت پر غور کریں تو دیکھیں گے کہ یہ لوگ اپنے فکر اور نظریئے کے مطابق خاص وجوہات میں زندگی کی سعادت کو پرکھتے اور جانچتے ہیں اور انہی وجوہات اور عناصر میں سعادت سمجھتے ہیں ۔مثلاً جو شخص خودکشی کرتا ہے وہ زندگی کی سختیوں اور مصیبتوں کی وجہ سے اپنے آپ کو موت کے منہ میں تصور کرتا ہے اور جو کوئی زہد و ریاضت میں مشغول ہو کر زندگی کی لذتوں کو اپنے لئے حرام کر لیتا ہے وہ اپنے نظریئے

اور طریقے میں ہی زندگی کی سعادت کو محسوس کرتا ہے۔

پس ہر انسان اپنی زندگی میں سعادت اور کامیابی کو حاصل کرنے کے لئے جدو جہد کرتا ہے خواہ وہ اپنی حقیقی سعادت کی تشخیص میں ٹھیک ہو یا غلط۔

۲۔ انسانی زندگی کی جدوجہد ہرگز پروگرام کے بغیر عمل میں نہیں آتی، یہ بالکل واضح اور صاف مسئلہ ہے اور اگر کسی وقت یہ مسئلہ انسان کی نظروں سے چھپا رہتا ہے تو وہ بار بار کے تکرار کی وجہ سے ہے، کیونکہ ایک طرف تو انسان اپنی خواہش اور اپنے ارادے کے مطابق کام کرتا ہے اور جب تک موجودہ وجوہات کے مطابق کسی کام کو ضروری نہیں سمجھتا اس کو انجام نہیں دیتا یعنی انسان کسی کام کو اپنے عقل و شعور کے حکم سے ہی کرتا ہے اور جب تک اس کی عقل اور اس کا ضمیر اس کام کی اجازت نہیں دیتے اس کام کو شروع نہیں کرتا، لیکن دوسری طرف جن کاموں کو اپنے لئے انجام دیتا ہے ان سے مقصد اپنی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے، لہٰذا اس کے کردار و افعال میں براہ راست ایک تعلق ہوتا ہے۔

کھانا، پینا، سونا، جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا، جانا، آنا وغیرہ سب کام ایک خاص اندازے اور موقع محل کے مطابق انجام پاتے ہیں۔ کہیں یہ کام ضروری ہوتے ہیں اور کہیں غیر ضروری ۔ ایک وقت میں مفید اور دوسرے وقت میں ضرر رساں یا غیر مفید ۔ لہٰذا ہر کام اس عقل و فکر اور انسانی شعور کے ذریعے انجام پاتے ہیں جو آدمی میں موجود ہے۔ اسی طرح ہر چھوٹا اور بڑا کام اسی کلی پروگرام کے مطابق کرتا ہے۔

ہر انسان اپنے انفرادی کاموں میں ایک ملک کی مانند ہے جس کے باشندے مخصوص قوانین، رسم و رواج میں زندگی گزارتے ہیں اور اس ملک کی مختار اور حاکم طاقتوں کا فرض ہے کہ سب سے پہلے اپنے کردار کو اس ملک کے باشندوں کے مطابق بنائیں اور پھر ان کو نافذ کریں۔

ایک معاشرے کی اجتماعی سرگرمیاں بھی انفرادی سرگرمیوں کی طرح ہوتی ہیں لہٰذا ہمیشہ ایک طرح کے قوانین و آداب و رسوم و اصول جو اکثریت کے لئے قابل قبول ہوں اس معاشرے میں حاکم ہونے چاہئیں ۔ ورنہ معاشرے کے اجزاء افراتفری اور ہرج و مرج کے ذریعے بہت تھوڑی مدت میں درہم برہم ہو کر رہ جائیں گے۔

بہر حال اگر معاشرہ مذہبی ہو تو حکومت بھی احکام مذہب کے مطابق ہوگی اور اگر معاشرہ غیر مذہبی اور متمدن ہو گا تو اس معاشرے کی تمام سرگرمیاں قانون کے تحت ہوں گی ۔ اگر معاشرہ غیر مذہبی اور غیر مہذب ہوگا تو اس کے لئے مطلق العنان اور آمرانہ حکومت نے جو قانون بنا کر اس پر ٹھونسا ہوگا یا معاشرے میں پیدا ہونے والے رسم و رواج اور قسم قسم کے عقائد کے مطابق زندگی بسر کرے گا۔

پس ہر حال میں انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی سرگرمیوں میں ایک خاص مقصد رکھنے کے لئے ناگزیر ہے، لہٰذا اپنے مقصد کو پانے کے لئے مناسب طریقۂ کار اختیار کرنے اور پروگرام کے مطابق کام کرنے سے ہرگز بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

قرآن مجید بھی اس نظریئے کی تائید و تصدیق فرماتا ہے : ولکل وجهة هو مولیها فاستبقوا

**الخیرات۔** (بقرہ ۱۴۸)

ترجمہ: تم میں سے ہر شخص کے لئے ایک خاص مقصد ہے جس کے پیش نظر کام کرتے ہو، پس ہمیشہ اچھے کاموں میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر کوشش کرو تا کہ اپنے اعلیٰ مقصد کو حاصل کر سکو۔

بنیادی طور پر قرآن مجید میں 'دین' کا مطلب طریقہ زندگی ہے اور مومن و کافر اور حتیٰ کہ وہ لوگ جو خالق (خداوند تعالیٰ) کے مکمل طور پر منکر ہیں، وہ بھی 'دین' کے بغیر نہیں ہیں کیونکہ انسانی زندگی ایک خاص طریقے کے بغیر ہرگز نہیں رہ سکتی خواہ وہ طریقہ نبوت اور وحی کی طرف سے ہو یا بناوٹی اور مصنوعی قانون کے مطابق، اللہ تعالیٰ ان ستمگاروں کے بارے میں جو خدائی دین سے دشمنی رکھتے ہیں اور کسی بھی طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں فرماتا ہے: **الذین یصدّون عن سبیل اللّٰہ و یبغونھا عوجا۔** (اعراف ۴۵)

ترجمہ: جو خدا کی راہ سے لوگوں کو ہٹاتے اور روکتے ہیں اور اس میں جو فطری زندگی کی راہ ہے (خواہ مخواہ) اس کو توڑ موڑ کر اپنے لئے اپناتے ہیں۔

۳۔ زندگی کا بہترین اور ہمیشگی طریقہ وہ ہے جس کی طرف انسانی فطرت رہنمائی کرے، نہ وہ کہ جو ایک فرد یا معاشرے کے احساسات سے پیدا ہوا ہو۔ اگر فطرت کے ہر ایک جزء کا گہرا اور بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ہر جزء زندگی کا ایک مقصد اور غرض و غایت لئے ہوئے ہے جو اپنی پیدائش سے لے کر اس خاص مقصد کی طرف متوجہ ہے اور اپنے مقصد کو پانے کے لئے نزدیک ترین اور مناسب ترین راہ کی تلاش میں ہے، یہ جزء اپنے اندرونی اور بیرونی ڈھانچے میں ایک خاص ساز و سامان سے آراستہ ہے جو اس کے حقیقی مقصود اور گوناگوں سرگرمیوں کا سرچشمہ شمار ہوتا ہے۔ ہر جاندار اور بے جان چیز میں فطرت کا یہی رویہ اور طریقہ کارفرما ہے۔

مثلاً گندم کا پودا اپنی پیدائش کے پہلے دن ہی، جب وہ مٹی سے اپنی سرسبز اور ہری بھری پتی کے ساتھ دانے سے باہر نکلتا ہے تو وہ (شروع سے ہی) اپنی فطرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے، یعنی یہ کہ وہ ایک ایسا پودا ہے جس کے کئی خوشے ہیں اور اپنی فطری طاقت کے ساتھ عنصری اجزاء کو زمین اور ہوا سے خاص نسبت سے حاصل کرتا ہے اور اپنے وجود کا حصہ بناتے ہوئے دن بدن بڑھتا اور پھیلتا رہتا ہے اور ہر روز اپنی حالت کو بدلتا ہے، یہاں تک کہ ایک کامل پودا بن جاتا ہے جس کی متعدد شاخیں اور خوشے ہوتے ہیں، پھر اس حالت کو پہنچ کر اپنی رفتار اور ترقی کو روک دیتا ہے۔

ایک اخروٹ کے درخت کا بھی اگر بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی اپنی پیدائش کے دن سے لے کر ایک خاص مقصد اور ہدف کی طرف متوجہ ہے یعنی یہ کہ وہ ایک اخروٹ کا درخت ہے جو تنومند اور بڑا ہے، لہٰذا اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے اپنے خاص اور مناسب طریقے سے زندگی کی راہ کو طے کرتا ہے اور اسی طرح اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرتا ہوا اپنے انتہائی مقصد کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ یہ درخت گندم کے پودے کا راستہ اختیار نہیں کرتا جیسا کہ گندم کا پودا بھی اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں اخروٹ

کے درخت کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔

تمام کائنات اور مخلوقات جو اس ظاہری دنیا کو بناتی ہیں، اسی قانون کے تحت عمل کرتی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ نوعِ انسان اس قانون اور قاعدے سے مستثنٰی ہو (انسان اپنی زندگی میں جو مقصد اور غرض و غایت بھی رکھتا ہو اس کی سعادت اسی مقصد کو پانے کے لئے ہے اور وہ اپنے مناسب ساز و سامان کے ساتھ اپنے ہدف تک پہنچنے کی تگ و دو میں مصروف ہے) بلکہ انسانی زندگی کے ساز و سامان کی بہترین دلیل یہ ہے کہ وہ بھی دوسری ساری کائنات کی طرح ایک خاص مقصد رکھتا ہے جو اس کی خوش بختی اور سعادت کا ضامن ہے اور اپنے پورے وسائل اور کوشش کے ساتھ اس راہِ سعادت تک پہنچنے کی جد و جہد کرتا ہے۔

لہٰذا جو کچھ اوپر عرض کیا گیا ہے وہ خاص انسانی فطرت اور آفرینشِ جہان کے بارے میں ہے کہ انسان بھی اسی کائنات کا اٹوٹ انگ ہے۔ یہی چیز انسان کو اس کی حقیقی سعادت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اسی طرح سب سے اہم، پائیدار اور مضبوط قوانین جن پر چلنا ہی انسانی سعادت کی ضمانت ہے، انسان کی راہنمائی کرتے ہیں۔

گزشتہ بحث کی تصدیق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

**قال ربنا الذی اعطیٰ کل شئی خلقه ثم هدیٰ۔**

(سورۂ طٰہٰ ۵۰)

ترجمہ: ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز اور ہر مخلوق کو ایک خاص صورت (فطرت) عطا فرمائی، پھر ہر چیز کو سعادت اور خاص مقصد کی طرف رہنمائی کی۔

پھر فرماتا ہے: **الذی خلق فسویٰ۔ والذی قدّر فهدیٰ۔** (اعلیٰ ۲۔۳)

ترجمہ: وہ خدا جس نے مخلوق کے اجزا کو جمع کر کے (دنیا کو) بنایا اور وہ خدا جس نے ہر چیز کا خاص انداز مقرر کیا، پھر اس کو ہدایت فرمائی۔

پھر فرماتا ہے: **و نفس و ما سوّٰها۔ فالهمها فجورها و تقوٰها۔ قد افلح من زکّٰها۔ وقد خاب من دسّٰها۔** (شمس ۷۔۱۰)

قسم اپنے نفس کی اور جس نے اس کو پیدا کیا اور پھر اس نے نفس کو بدکاری اور پرہیز گاری کا راستہ بتایا۔ جس شخص نے اپنے نفس کی اچھی طرح پرورش کی اس نے نجات حاصل کی اور جس شخص نے اپنے نفس کو آلودہ کیا وہ تباہ و برباد ہو گیا۔

پھر خدا تعالیٰ فرماتا ہے: **فاقم وجهک للدّین حنیفاً ط فطرت اللّٰه التی فطر الناس علیها ط لا تبدیل لخلق اللّٰه ط ذالک الدین القیم۔** (روم ۳۰)

ترجمہ: اپنے (رخ) آپ کو دین پر استوار کر، پوری توجہ اور تہہ دل سے دین کو قبول کر، لیکن اعتدال پسندی کو اپنا پیشہ بنا اور افراط و تفریط سے پرہیز کر، یہی خدا کی فطرت ہے اور خدا کی فطرت میں تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ یہی وہ دین ہے جو انسانی زندگی کا انتظام کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ (مضبوط اور بالکل سیدھا دین ہے)

پھر فرماتا ہے: **انّ الدین عند اللّٰه الاسلام۔**

(آل عمران ۱۹)

ترجمہ: دین اور زندگی کا طریقہ خدا کے سامنے

جھکنے میں ہی ہے، اس کے ارادے کے سامنے سر تسلیم خم کرنے میں ہے، یعنی اس کی قدرت اور فطرت کے سامنے، جو انسان کو ایک خاص قانون کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اور دوسری جگہ فرماتا ہے :و من یبتغ غیر **الاسلام دینافلن یقبل منہ۔ (آل عمران ۸۵)**

ترجمہ: جو کوئی دین اسلام کے بغیر یعنی خدا کے ارادے کے بغیر کسی اور دین کی طرف رجوع کرے تو اس کا وہ دین یا طریقہ ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

مندرجہ بالا آیات اور ایسی ہی دوسری آیات جو اس مضمون کی مناسبت میں نازل ہوئی ہیں ان کا نتیجہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنی ہر مخلوق اور منجملہ انسان کو ایک خاص سعادت اور فطری مقصد کی طرف یعنی اپنی فطرت کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور انسانی زندگی کے لئے حقیقی اور واقعی راستہ وہی ہے جس کی طرف اس (انسان) کی خاص فطرت دعوت کرتی ہے، لہٰذا انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں قوانین پر کاربند ہے کیونکہ ایک حقیقی اور فطری انسان کی طبیعت اسی کی طرف رہنمائی کرتی ہے نہ کہ ایسے انسانوں کو جو ہوا و ہوس اور نفسِ امّارہ سے آلودہ ہوں اور احساسات کے سامنے دستہ بستہ اسیر ہوں۔

فطری دین کا تقاضہ یہ ہے کہ انسانی وجود کا نظام درہم برہم نہ ہونے پائے اور ہر ایک (جزء) کا حق بخوبی ادا ہو۔لہٰذا انسانی وجود میں جو مختلف اور متضاد نظام مثلاً گوناگوں احساساتی قوتیں اللہ تعالیٰ نے بخشی ہیں وہ منظّم صورت میں موجود ہیں، یہ سب قوتیں اس حد تک دوسروں کے لئے مزاحمت پیدا نہ کریں، ان کو عمل کا اختیار دیا گیا ہے

اور آخر کار انسان کے اندر عقل کی حکومت ہونی چاہئے نہ کہ خواہشاتِ نفسانی و احساسات و جذبات کا غلبہ اور معاشرے میں بھی انسانوں کے حق و صلاح پر مبنی حکومت قائم ہو نہ کہ ایک آمرانہ اور ایک طاقتور انسان کی خواہشات اور ہوا وہوس کے مطابق اور نہ ہی اکثریت افراد کی خواہشات کے مطابق اگرچہ وہ حکومت ایک جماعت یا گروہ کی صلاح اور حقیقی مصلحت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

مندرجہ بالا بحث سے ایک اور نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تشریعی (شرعاً و قانوناً) لحاظ سے حکومت صرف اللہ کی ہے اور اس کے بغیر حکومت کسی اور کا حق نہیں ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
ع حکمراں اک وہی باقی بتان آذری (اقبال) کہ فرائض، قوانین اور شرعی قوانین بنائے یا تعین کرے، کیونکہ جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ صرف وہی قوانین اور قواعد انسانی زندگی کے لئے مفید ہیں جو اس کے لئے فطری طریقے پر معیّن کئے گئے ہوں یعنی اندرونی اور بیرونی عناصر و عوامل اور علل انسان کو ان فرائض کی انجام دہی کی دعوت کریں اور اس کو مجبور کریں مثلاً ان کے انجام دینے میں خدا کا حکم شامل ہو، کیونکہ جب ہم کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ اس کام کو چاہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کو انجام دینے کی تمام شرائط اور وجوہات کو پہلے سے پیدا کیا ہوا ہے، لیکن کبھی کبھی یہ وجوہات اور شرائط ایسی ہیں کہ کسی چیز کی جبری

پیدائش کا موجب اور سبب بن جاتی ہیں، جیسے روزانہ قدرتی حوادث کا وجود میں آنا اور اس صورت میں اس خدائی ارادے کو ''تکوینی ارادہ'' کہتے ہیں اور کبھی یہ وجوہات اور شرائط اس قسم کی ہیں کہ انسان اپنے عمل کو اختیار اور آزادی کے ساتھ انجام دیتا ہے جیسے کھانا، پینا وغیرہ۔ اور اس صورت میں اس عمل کو ''تشریعی ارادہ'' کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں کئی جگہ فرماتا ہے: اِنِ الحُکمُ اِلاَّ لِلّٰہِ (یوسف ۴۰، ۶۷)

ترجمہ: خدا کے سوا کوئی اور حاکم نہیں ہے اور حکومت صرف اللہ ہی کے واسطے ہے۔

اس مقدمہ کے واضح ہوجانے کے بعد جان لینا چاہیئے کہ قرآن مجید ان تین مقدموں کے پیش نظر کہ انسان اپنی زندگی میں ایک خاص مقصد اور غرض و غایت رکھتا ہے (یعنی زندگی کی سعادت) جس کو اپنی پوری زندگی میں حاصل کرنے کے لئے جد و جہد اور کوشش کرتا ہے اور یہ کوشش بغیر کسی پروگرام کے نتیجہ بخش نہیں ہوگی، لہٰذا اس پروگرام کو بھی خدا کی کتاب فطرت آفرینش میں ہی پڑھنا چاہیئے۔ دوسرے لفظوں میں اس کو خدائی تعلیم کے ذریعے ہی سیکھا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید نے ان مقدمات کے پیش نظر انسانی زندگی کے پروگرام کی بنیاد اس طرح رکھی ہے:-

قرآن مجید نے اپنے پروگرام کی بنیاد ''خدا شناسی'' پر رکھی ہے اور اس طرح ''ماسو اللہ'' سے بیگانگی کو شناخت دین کی اولین بنیاد قرار دیا ہے۔ اس طرح خدا کو پہچنوانے کے بعد ''معاد شناسی'' (روز قیامت پر اعتقاد جس دن انسان کے اچھے برے کاموں کا بدلہ اور عوضانہ دیا جائے گا) کا نتیجہ حاصل ہوتا ہے اور اس کو ایک دوسرا اصول بنایا۔ اس کے بعد معاد شناسی سے پیغمبر شناسی کا نتیجہ حاصل کیا، کیونکہ اچھے اور برے کاموں کا بدلہ، وحی اور نبوت کے ذریعے اطاعت، گناہ نیک و بد کاموں کے بارے میں پہلے سے بیان شدہ اطلاع کے بغیر نہیں دیا جاسکتا۔

اس مسئلہ کو بھی ایک الگ اصول بیان فرمایا:

مندرجہ بالا تین اصولوں یعنی ماسواللہ کی نفی پر ایمان، نبوت پر اعتقاد اور معاد پر ایمان کو دینِ اسلام کے اصول کہا ہے۔

اس کے بعد دوسرے درجہ پر اخلاقِ پسندیدہ اور نیک صفات جو پہلے تین اصولوں کے مناسب ہوں اور ایک حقیقت پسند اور باایمان انسان کو ان صفات حمیدہ سے متصف اور آراستہ ہونا چاہئے، بیان فرمایا۔ پھر عملی قوانین جو دراصل حقیقی سعادت کے ضامن اور اخلاق پسندیدہ کو جنم دے کر پرورش دیتے ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر حق وحقیقت پر مبنی اعتقادات اور بنیادی اصولوں کو ترقی ونشوونما دیتے ہیں، ان کی بنیاد ڈالی اور ان کے بارے میں وضاحت فرمائی۔

کیونکہ جو شخص جنسی مسائل یا چوری، خیانت خرد برد اور دھوکے بازی میں ہر چیز کو جائز سمجھتا ہے اس سے کسی قسم کی پاکِ نفس جیسی صفات کی ہرگز توقع نہیں رکھی جاسکتی یا جو شخص مال و دولت جمع کرنے کا شائق اور شیفتہ ہے اور لوگوں کے مالی حقوق اور قرضوں کی ادائیگی کی طرف ہرگز توجہ نہیں کرتا وہ کبھی سخاوت کی صفت سے متصف نہیں ہوسکتا یا جو شخص خدا تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتا اور ہفتوں بلکہ مہینوں تک خدا کی یاد سے غافل رہتا ہے وہ کبھی خدا اور روز قیامت پر ایمان اور

ایسے ہی ایک عابد کی صفات رکھنے سے قاصر ہے۔

پس پسندیدہ اخلاق، مناسب اعمال و افعال کے سلسلے ہی سے زندہ رہتے ہیں۔ چنانچہ پسندیدہ اخلاق، بنیادی اعتقادات کی نسبت یہی حالت رکھتے ہیں۔ مثلاً جو شخص کبر و غرور، خودغرضی اور خود پسندی کے سوا کچھ نہیں جانتا تو اس سے خدا پر اعتقاد اور مقام ربوبیت کے سامنے خضوع وخشوع کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ جو شخص تمام عمر انصاف و مروت اور رحم وشفقت اور مہربانی کے معنی سے بے خبر ہے وہ ہرگز روزِ قیامت میں سوال وجواب پر ایمان نہیں رکھ سکتا۔

خداوند تعالیٰ حقانی اعتقادات اور پسندیدہ اخلاق کے سلسلے میں جو خود ایمان اور اعتقاد سے وابستہ ہیں، اس طرح فرماتا ہے: اِلَیهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الْعَملُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهُ ط (فاطر ۱۰)

ترجمہ: خدا تعالیٰ پر پختہ اور پاک ایمان ہمیشہ بڑھتا ہی رہتا ہے اور اچھے کاموں کو وہ خود بلند فرماتا ہے، یعنی اعتقادات کو زیادہ کرنے میں مدد دیتا ہے۔

اور خصوصاً عمل پر اعتقاد کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے: ثُم کان عاقِبةُ الذین اَساءُ و السُّوٓایٓ اَنْ کَذَّبوا بِاٰیاتِ اللّٰہِ وَ کانُو ابِهایَستهزِءون (روم ۱۰)

ترجمہ: اس کے بعد آخرکار جو لوگ برے کام کرتے تھے ان کا کام یہاں تک آپہنچا کہ خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان کے ساتھ مسخرہ پن کرتے تھے۔

مختصر یہ کہ قرآن مجید حقیقی اسلام کی بنیادوں کو کلی طور پر مندرجہ ذیل تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے:-

۱۔ اسلامی اصول و عقائد جن میں دین کے تین اصول شامل ہیں: یعنی توحید، نبوت اور معاد (قیامت) اور اس قسم کے دوسرے فرعی عقائد مثلاً لوح، قلم، قضا، قدر، ملائکہ، عرش، کرسی اور آسمان و زمین کی پیدائش وغیرہ۔

۲۔ پسندیدہ اخلاق

۳۔ شرعی احکام اور عملی قوانین جن کے متعلق قرآن مجید نے کلی طور پر بیان فرمایا ہے اور ان کی تفصیلات اور جزئیات کو پیغمبر اکرمؐ کے بیانات یا توضیحات پر چھوڑ دیا ہے اور پیغمبر اکرمؐ نے بھی ''حدیث ثقلین'' کے مطابق جس پر تمام اسلامی فرقے متفق ہیں اور مسلسل ان احادیث کو نقل کرتے رہے ہیں، اہلبیتؑ کو اپنا جانشین فرمایا ہے۔

## ب۔ قرآن مجید نبوت کی سند ہے

قرآن مجید چند جگہ وضاحت سے بیان فرماتا ہے کہ یہ (قرآن) خدا کا کلام ہے یعنی یہ کتاب انہی موجودہ الفاظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور پیغمبر اکرمؐ نے بھی انہی الفاظ میں اس کو بیان فرمایا ہے۔

اس معنی کو ثابت کرنے کے لئے کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے اور ایک انسان کا کلام نہیں، بار بار بہت زیادہ آیاتِ شریفہ میں اس موضوع پر زور دیا گیا ہے اور قرآن مجید کو ہر لحاظ سے ایک معجزہ کہا گیا ہے جو انسانی طاقت اور توانائی سے بہت بالا و برتر ہے۔

جیسا کہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: اَمْ یَقُولونَ تَقَوَّلَه بل لا یومِنون ۔فَلیاتو بِحَدیثٍ مِثله اِن کانوا صٰدقین (طور ۳۳، ۳۴)

ترجمہ: یا کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے خود قرآن کو بنا (گھڑ) کر اسے خدا سے منسوب کر دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اس پر ایمان نہیں لاتے۔ پس اگر وہ ٹھیک کہتے ہیں تو اس (قرآن) کی طرح عبارت کا نمونہ لائیں (بنائیں)۔

اور پھر فرمایا: **قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الانس و الجنّ علیٰ اَن یَّاتُو بِمِثل ھٰذا القرآنِ لا یَاتُون بِمِثلہ و لَو کان بَعضُہم لِبعضٍ ظَہیراً** (بنی اسرائیل/ اسریٰ ۸۸)

ترجمہ: اے رسولؐ کہہ دو کہ اگر (سارے جہان) کے آدمی اور جن اس بات پر اکھٹے اور متفق ہوں کہ قرآن کا مثل لے آئیں تو (ناممکن) اس کے برابر نہیں لا سکتے اگرچہ (اس کوشش میں) وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں۔

اور پھر فرمایا: **اَمْ یَقُولُونَ افْتَراہُ قُلْ فَاتُو بِعَشَرِ سُوَرٍ مِثْلِہِ مُفْتَرَیٰتٍ** (ہود ۱۳)

ترجمہ: کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص (تم) نے اس (قرآن) کو اپنی طرف سے گھڑلیا ہے تو تم ان سے صاف صاف کہہ دو کہ اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو (زیادہ نہیں) ایسی ہی دس سورتیں اپنی طرف سے گھڑ کے لے آؤ۔

اور پھر فرماتا ہے: **اَمْ یَقُوْلُون افْتَراہُ قُل فَاْتُوا بِسُوْرَۃٍ مِثْلِہِ** (سورۂ یونس ۳۸)

ترجمہ: آیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو رسول نے خود جھوٹ موٹ بنا کر خدا سے منسوب کر لیا ہے، پس اے رسولؐ ان سے کہہ دو کہ اس کی مانند صرف ایک ہی سورت لکھ کر لے آؤ۔

اور پھر (ان لوگوں کا) پیغمبر اکرمؐ سے مقابلہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: **و اِنْ کُنتُم فی رَیْبٍ مِمَّا نَزَّلْنا علیٰ عبدِنا فَاْتُو ابِسُورۃٍ مِن مِثْلِہ** (بقر ۲۳)

ترجمہ: اور جو چیز (قرآن) ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے اگر تمہیں اس میں کسی قسم کا شک وشبہ ہے تو ایسے انسان کی طرح جو لکھا پڑھا نہیں اور جاہلیت کے ماحول میں اس کی نشوونما ہوئی ہے، اس طرح کی ایک قرآنی سورت لکھ کر لاؤ۔

اور پھر اختلاف اور تضاد نہ رکھنے کے متعلق برابری اور مقابلہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: **اَفَلایَتدَبَّرُونَ القرآنَ و لَو کان مِنْ عِنْدِ غَیرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیہِ اِختِلافاً کَثِیرا** (نساء ۸۲)

ترجمہ: آیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے اور اگر یہ قرآن خدا کے بغیر کسی اور کی طرف سے آیا ہوتا تو اس میں بہت زیادہ اختلافات ہوتے کیونکہ اس دنیا میں ہر چیز تغیر اور ترقی پذیری کے قانون میں شامل ہے اور وہ اختلاف اجزاء اور احوال سے مبرا نہیں ہوتی اور اگر قرآن انسان کا بنایا ہوا ہوتا تو جیسا کہ تیئس سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا تو یہ (قرآن) اختلافات اور تضادات سے مبرا نہیں ہو سکتا تھا اور اس طرح ہر گز یکساں نہ ہوتا۔

قرآن مجید جوان فیصلہ کن اور پختہ انداز سے خدا کا کلام ہونے کا اعلان اور اس کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اول سے لے کر آخر تک صاف طور پر حضرت محمدؐ کا اپنے رسول اور پیغمبر کے طور پر تعارف کراتا ہے اور اس طرح آنحضرتؐ کی نبوت کی سند لکھتا ہے۔ اسی بناء پر کئی بار خدا کے کلام میں پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ اپنی نبوت اور پیغمبری کے

بقیہ صفحہ ۲۰/ پر

# حضرت سیدۃ النساء فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا

آیت اللہ العظمٰی سید علی نقی النقوی طاب ثراہ

**نام ونسب:-** نام فاطمہؑ، مشہور ترین لقب زہرا اور کنیت ام ابیہا تھی۔ آپ حضرت خدیجہ بنت خویلد کے بطن سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرد فرید بیٹی تھیں جن کی نسل پاک سے باپ کے نام اور کام کی بقاء رہی اور شاید اسی مناسبت سے آپ کی وہ کنیت ہوئی جس کے معنی ہوتے ہیں اپنے باپ کی ماں یعنی وہ خاتون جو اپنے باپ کی زندگی کو پروان چڑھانے کا سبب ہوئی۔

**ولادت:-** یوں تو فرقہ وارانہ اختلافات کے ساتھ بہت سی تاریخی حقیقتیں ایسی ہیں جو مرکز اختلاف بن گئی ہیں، خصوصاً ولادت اور وفات کی تاریخوں کے بارے میں تو خود ایک فرقہ کے روایات میں بھی اکثر اختلاف ہوتا ہے مگر عموماً یہ اختلاف چند مہینوں یا دو ایک برس سے آگے نہیں بڑھتا لیکن حضرت سیدۂ عالم کی تاریخ ولادت کے بارے میں فرق اسلامیہ میں جو اختلاف ہے وہ ذرا سے ہیر پھیر کے نتیجہ میں نو دس برس کی طولانی مدت کا فرق پیدا کر دیتا ہے۔ اس لئے کہ مؤرخین اہل سنت کی اکثریت کا قول یہ ہے کہ آپ کی ولادت بعثت سے پانچ برس پہلے ہوئی تھی اور فرقہ شیعہ کی روایات یہ ہیں کہ آپ بعثت سے پانچ برس بعد پیدا ہوئی تھیں۔ ان روایات کی بنیاد اہل بیت معصومینؑ کی ارشادات پر ہے۔ مذہبی طور ان روایات کے مستند ہونے علاوہ غالباً ہر غیر جانب دار محقق تاریخی نقطہ نگاہ سے بھی اس سے اتفاق کرے گا کہ کسی شخصیت اور بالخصوص پردہ نشیں خاتون کے متعلق اس کے گھرانے والوں بلکہ اولاد کا بیان جتنا معتبر ہوسکتا ہے اتنا کسی غیر کا بیان معتبر نہیں ہوسکتا۔ ان بیانات کی بنا پر صحیح قول یہی قرار پاتا ہے کہ حضرت سیدۂ عالم ۲۰؍ جمادی الثانی کو بعثت کے پانچویں سال یعنی ہجرت کے آٹھ برس قبل پیدا ہوئیں۔

**تربیت:-** رسولؐ کی بعثت کے دسویں برس خدیجۂ کبریٰ نے دنیا سے مفارقت کی، اس وقت سیدۂ عالم صرف پانچ سال کی تھیں، اتنی مختصر عمر میں ماں کی آغوش شفقت سے جدائی کے بعد آپ کا گہوارۂ تربیت صرف باپ کا سایۂ رحمت تھا اور پیغمبر اسلامؐ کی اخلاقی تربیت کا آفتاب تھا جس کی شعاعیں براہ راست اس بے نظیر گوہر کی آب وتاب میں اضافہ کر رہی تھیں۔ عورتوں میں اگر کسی کی صحبت اس عمر میں جناب سیدہ کو حاصل ہوسکتی تھی تو وہ حضرت علی ابن ابیطالبؑ کی والدہ فاطمہ بنت اسد ہوسکتی ہیں یا آپ کی بہنیں ام ہانی وغیرہ یا پھوپھی صفیہ بنت عبدالمطلب۔ یہ تمام بزرگ خواتین تھیں جو سیدۂ عالم کی شمع عصمت کا پروانہ بنی رہتی ہوں گی اور اسی ماحول میں سیدہؑ کا بچپنا اپنی منزلیں طے کر رہا تھا۔

**غم خواری:-** سیدہؑ کا بچپن اپنے والد بزرگوار کو اس ناگوار ماحول میں دیکھتے گزرا جو پیام توحید پہونچانے اور پھر حضرت ابو طالب اور جناب خدیجہ کے دنیا سے اٹھ

جانے کے بعد درپیش تھا۔ سیدہ اکثر اپنے باپ کے سر مبارک پر اشاعت حق کے جرم میں کوڑا کرکٹ پھینکا جانا سنتیں اوران کے جسم کو پتھروں سے لہولہان دیکھتیں تھیں اور ان منصوبوں کا چرچا ان کے کانوں تک پہونچتا تھا جوان کے والد بزرگوار کے مشن بلکہ ان کی زندگی کو بھی ختم کرنے کے لئے قائم کیے جاتے تھے۔مگراس کمسنی کے عالم میں بھی سیدۂ عالم نہ ڈریں نہ سہمیں نہ گھبرائیں بلکہ اس ننھی سی عمر میں اپنے بزرگ مرتبہ باپ کی مددگار رہیں۔

**ہجرت:۔** ''سیدۂ عالمؑ'' کی آٹھ برس کی عمر تھی، جب کافروں نے ایکا کر کے ایک شب رسولؐ کو قتل کرنے کا ارادہ کر کے آپ کے گھر کو گھیر لیا۔ آپ کو قدرت کی طرف سے اس کی اطلاع پہلے ہوگئی تھی، اس لیے آپ اپنے چچازاد بھائی حضرت علی بن ابی طالبؑ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دے کر خود مخفی طریقہ پر مکۂ معظّمہ سے مدینۂ منورہ کی طرف روانہ ہوگئے تھے۔ حضرت علیؑ بستر رسولؐ پر تھے اور مکان کے اندر حضرت علی بن ابی طالبؑ کی والدہ فاطمہ بنت اسد کے ساتھ سیدۂ عالم فاطمہ زہراؑ بھی تھیں۔ اس وقت آپ کی عمر آٹھ سال کی تھی، اور یہ یقیناً آپ کی زندگی کا بڑا امتحان تھا اپنے گھر کے گرد خون کے پیاسے دشمنوں اوران کی کھنچی ہوئی تلواروں کا گھیرا تھا۔ جس سے گھر میں رہ جانے والے سب ہی افراد پر ظاہری اسباب کے لحاظ سے دہشت پیدا ہونا چاہیئے اور ادھر باپ کی جدائی کا صدمہ اور ان کی جان کی حفاظت کا خیال مگر سیدہ نے اسی کمسنی میں اس مرحلہ کو صبر واستقلال سے طے کیا۔ پھر صبح کو جب دشمنوں نے دیکھا کہ رسولؐ چلے گئے ہیں، اوران کی جگہ پر علیؑ ہیں تو وہ سب گھر کو چھوڑ کر رسولؐ کی تلاش میں چلے گئے، اس وقت مکان کے رہنے والوں سے وقتی طور پر خطرہ دور ہوگیا، مگر رسولؐ کے متلعق ان کی فکر بڑھ گئی ہوگی۔ پھر چند روز کے بعد علی ابن ابیطالبؑ کا تن تنہا ان خواتین کو محملوں میں سوار کر کے اپنے ساتھ لینا اور مکہ سے نکل کر مدینہ کی طرف روانہ ہونا اور راستے میں مشرکین کا آکر سدِّ راہ ہونا اور علیؑ کا تلوار کھینچنا، یہ سب عورتوں اور بچوں کے لیے کچھ کم دہشت ناک حالات نہ تھے جن سے گزر کر سیدۂ عالم اپنے والد بزرگوار کے پاس مدینۂ منورہ پہونچ گئیں۔

**شادی:۔** مدینۂ منورہ پہونچنے کے بعد ایک سال کے اندر فاطمہ زہراؑ کی عمر نو برس کی ہوگئی۔ شریعت اسلام میں یہ سن لڑکی کے بلوغ کا قرار دیا گیا ہے اور تاکید ہے کہ اس کے بعد شادی میں دیر نہ کی جائے۔ اصحاب رسولؐ میں بہت سے افراد رسولؐ کی طرف دامادی کی نسبت حاصل کرنے کے شرف کی تمنا رکھتے تھے مگر اس کے پہلے صاحبزادی کی کمسنی کا عذر اس سوال میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ اب جب کہ ابتدائی عمر شادی کی آگئی تو مجسم خلق عظیم رسولؐ کی بارگاہ میں ہر ایک عرض تمنا کے لیے آنے لگا مگر رسولؐ کی طرف سے کوئی ہمت افزا جواب نہ ملا خدا اور رسولؐ کے نزدیک فاطمہ زہراؑ کے ساتھ شادی کے لیے صرف ایک فرد موزوں تھی، جواب تک خاموش تھی۔ یہ علیؑ کی ذات تھی، جنہوں نے رسولؐ کی گود میں بچپن سے پرورش پائی تھی اور جس طرح فاطمہؑ اپنے طبقہ میں آپ کی اخلاقی تعلیم

کا بہترین مرقع تھیں، اسی طرح علیؑ مردوں میں آپ کے تعلیمات کا مجسمہ تھے۔علیؑ کے لیے فاطمہؑ اور فاطمہؑ کے لیے علیؑ کے سوا برابر کا کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا تھا، مگر علیؑ رسولؐ سے خواستگاری کرتے ہوئے حجاب محسوس کر رہے تھے اور رسولؐ کو خود سے اس بارے میں کسی ارشاد کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ جب ہر ایک اظہار تمنا کرنے والے کی خواہش ٹھکرا دی گئی تو انھی میں سے کچھ نے حضرت علی ابن ابیطالبؑ سے تحریک کی کہ آپ بھی رسولؐ کی خدمت میں جا کر فاطمہؑ کی خواستگاری کریں۔ آخر علیؑ رسولؐ کی بارگاہ میں آئے جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ عرض تمنا کی۔ رسولؐ نے بشاش چہرہ کے ساتھ فرمایا کہ ''تمہارے پاس مال دنیا سے کچھ ہے؟'' عرض کیا ''بس گھوڑا، تلوار اور زرہ'' فرمایا ''گھوڑا اور تلوار تمہارے ایسے مجاہد کے لیے ضروری ہے مگر زرہ زائد ہے اس کو فروخت کر ڈالو'' عام مؤرخین کے مطابق یہ زرہ ۴۸۰ درہم کو فروخت ہوئی، اس رقم کو آپ نے بطور مہر سیدۂ عالم رسولؐ کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ اسی سے رسولؐ نے فاطمہؑ کی شادی کا سامان کیا اور بیٹی کے لیے نظام خانہ داری میں جن اسباب کی ضرورت تھی وہ خرید فرمایا۔ وہ کیا تھا، ایک چمڑے کا تکیہ کھجور کی چھال سے بھرا ہوا، ایک بچھونا کھال کا اور کچھ مٹی کے برتن، ایک مشکیزہ اور ایک چرخہ۔ ان مؤرخین کا بیان ہے کہ وہ مہر فاطمہ زہراؑ کا جو حضرت علی بن ابیطالبؑ نے ادا کیا اور جس پر حضرت فاطمہ زہراؑ کا نکاح پڑھا گیا، چار سو مثقال چاندی تھا۔ تقریباً یہی مقدار پانچ سو درہم ''مہر سنت'' قرار پائی ہے۔ جس کی مقدار ایک سو سترہ تولہ چاندہو تی ہے۔ مگر مہر سنت کا مطلب یہ ہے کہ اس سے زیادہ ہونا فضیلت کے خلاف ہے اتنا ہی ہو اور یا اس سے کم ہو اور اسی لیے فرقۂ شیعہ کے معتبر ترین جوامع حدیث یعنی کتب اربعہ کے بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا مہر ظاہری طور پر اس عام مہر سے بھی جو مہر سنت قرار دیا گیا ہے، بہت کم یعنی صرف تیس درہم قرار دیا گیا تھا اگر چہ خالق کی طرف سے حضرت سیدۂ عالم کی روحانی عظمت کے لحاظ سے مہر سیدہ میں خدا کی خدائی کا بہت بڑا حصہ تھا مگر سیدہ کے مہر کو ظاہری حیثیت سے بہت کم رکھ کر ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کی اس ذہنیت کو تبدیل کرنے کا سامان کیا گیا کہ وہ مہر کی رقم کے خواہ مخواہ زیادہ ہونے کو معیار عزت نہ سمجھ لیں بلکہ یہ سمجھیں کہ مہر کا کم ہونا سیدۂ عالم کی پیروی ہونے کے لحاظ سے بہت بڑی عزت کا سرمایہ ہے۔ آخر کو اسلامی تاریخ میں ایک مثالی تقریب کے طور پر یہ شادی عمل میں آئی اور اگر مسلمان اس شادی کی کیفیت کو پیش نظر رکھیں تو کبھی بے جا رسوم سے اپنی بربادی کی صورتیں اختیار کرنے میں عزت محسوس نہ کریں۔

**اولاد:-** شادی ہونے کے بعد حضرت فاطمہ زہراؑ صرف نو برس زندہ رہیں۔ اس نو برس میں آپ کے یہاں شادی کے دوسرے ہی سال حضرت امام حسنؑ پیدا ہوئے، تیسرے سال حضرت امام حسینؑ پھر غالباً پانچویں سال حضرت زینبؑ اور ساتویں سال حضرت ام کلثوم، نویں سال محسن بطن میں تھے جب کہ وفات رسولؐ ہوئی اور وہ ناگوار مصائب پیش آئے جن کے سبب سے اسقاط ہو گیا اور پھر

حضرت سیدہ بھی جانبر نہ ہو سکیں ۔وفات کے وقت دو صاحبزادے حسنؑ اور حسینؑ موجود تھے جو امام خلق ہوئے اور دو صاحبزادیاں زینب و ام کلثوم تھیں جو اپنے اوصاف کے لحاظ سے طبقۂ خواتین میں اپنی ماں کی سچی جانشین ثابت ہوئیں۔

**اخلاق واوصاف:-** سیدۂ عالم شکل وشمائل، گفتار ورفتار اور حسنِ بیان ہر بات میں رسولؐ سے انتہائی مشابہ اور خصوصیت کے ساتھ سچائی اور امانت داری میں اپنے والد بزرگوار کی مکمل تصویر تھیں۔آپ نے اپنی مختصر زندگی میں نسوانی زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی بلند سیرت کے وہ نمایاں نقوش چھوڑے ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ اس طبقہ کی رونمائی کے لیے کافی ہیں۔

**خانہ داری:-** فاطمہ زہراؑ نے شادی کے بعد سے تمام گھر کا کام اپنے ہاتھ سے کرنا شروع کیا، جھاڑو دینا، کھانا پکانا، چرخہ چلانا، چکّی پیسنا اور بچوں کی تربیت کرنا، یہ سب کام اور ایک اکیلی سیدہؑ! لیکن نہ کبھی تیوریوں پر بل آئے نہ اپنے شوہر حضرت علی ابن ابیطالبؑ سے کبھی اپنے لیے کسی مددگار خادمہ کے انتظام کی فرمائش کی۔ایک مرتبہ اپنے پدر بزرگوار حضرت رسولؐ خدا سے ایک کنیز عطا کرنے کی خواہش کی تو رسولؐ نے بجائے کنیز عطا فرمانے کے وہ تسبیح تعلیم فرمائی جو تسبیح فاطمہ زہراؑ کے نام سے مشہور ہے۔ ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر، ۳۳ مرتبہ الحمدللہ اور ۳۳ سبحان اللہ، حضرت فاطمہؑ اس تسبیح کی تعلیم سے اتنی خوش ہوئیں کہ کنیز کی خواہش ترک کر دی بعد میں رسولؐ نے بلا طلب ایک کنیز عطا فرمائی جو فضّہ کے نام سے مشہور ہے۔سیدہؑ فضہ کے ساتھ ایک کنیز کا سا نہیں بلکہ برابر سے ایک عزیز، رفیق کا سا برتاؤ کرتی تھیں۔اسلام کی تعلیم یقیناً یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں زندگی کے جہاد میں مشترک طور پر حصہ لیں اور کام کریں، بیکار نہ بیٹھیں، مگر ان دونوں میں صنف کے اختلاف کے لحاظ سے تقسیم عمل ہے اس تقسیم کار کو علیؑ اور فاطمہؑ نے مکمل طریقہ پر دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔گھر سے باہر کے تمام کام آب کشی کرنا، باغوں میں پانی دینا، اور اپنی قوت بازو سے اپنے اور اپنے گھر والوں کی بسر زندگی کا سامان کرنا۔یہ علیؑ کے ذمہ تھے اور گھر کے اندر کے تمام کام حضرت فاطمہ زہراؑ انجام دیتی تھیں۔یہ ضروری نہیں کہ آج چودہ سو برس کے بعد بھی کاموں کی شکل وہی رہے جو پہلے تھی بلکہ زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان میں فرق ہو سکتا ہے مگر اس روح کو جو گھر کے اندر اور باہر کی زندگی کے تفرقہ کے ساتھ قائم ہے، محفوظ رکھا جانا ہر حال میں ضروری ہے۔

**تزک واحتشام اور آرائش سے علیحدگی:-** عام طور سے خواتین کی طبیعت اسباب زیب وزینت کی طرف خاص رغبت رکھتی ہے۔اس کے سبب سے اکثر مردوں کو پریشانی اٹھانا پڑتی ہے اور بسا اوقات آمد وخرچ کے توازن میں فرق کی ذمہ داری آرائش پسندی ہوتی ہے جس سے اقتصادی تباہی آتی ہے۔سیدۂ عالم نے ہمیشہ اپنی زندگی کو مسلمانوں کے غریب گھرانوں کی عورتوں کے لیے ایک بہترین نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا اور کبھی لباس وزیور یا سامانِ خانہ داری میں تصنع اور تجمل کو پسند نہیں کیا، اور خود

رسولؐ کی تعلیم بھی یہی رہی بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ ایک مرتبہ سیدۂ عالم نے اپنے لیے دو چاندی کے کنگن، گلوبند، اور دو گوشوارے اور دروازہ کا پردہ تیار کرالیا تھا اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو آپ کی صرف ایک معنی خیز خاموشی سے سیدہؑ کو بہتر یہ معلوم ہوا کہ اسے راہ خدا میں خیرات کردیں۔

رسالتمآبؐ کو یہ معلوم ہوا تو اتنا خوش ہوئے کہ تین مرتبہ فرمایا ''وہی کیا جو میں چاہتا تھا، اس کا باپ اس پر فدا ہوجائے۔'' اس معلم انسانیت عظیم ترین باپ کی یہ بلند مرتبہ بیٹی ہی صرف وہ تھی جو اس کے بلند اخلاقی معیار تعلیم کو عمل کی مجسم شکل میں اس نقطہ پر لا سکے جو اس کا معراج بلندی ہے۔

**عبادت و دعا کے موقع پر ایثار:۔** فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی عبادت وہ تھی جو عالمِ انسانیت کے اس طبقہ کے لئے جاودانی مثال ہے۔ عبادت بظاہر مخلوق اور خالق کے درمیان کی انفرادی چیز ہے اس لیے زیادہ تر عبادت کرنے والے ایسے ہوں گے جو شاید اپنے مال بلکہ غذا میں بھی دوسروں کو اپنے اوپر مقدم کر سکتے ہوں مگر اللہ کی بارگاہ میں تو ''خودغرضی'' ہی نظر آتی ہے۔ لیکن آل رسولؐ اس سے مستثنیٰ ہیں وہ خالق کی بارگاہ میں بھی کھڑے ہوتے تھے تو دوسرے مخلوق کا درد اپنے دل میں لیے ہوئے چنانچہ حضرت سیدۂ عالمؑ کے متعلق شاہزادۂ امام حسنؑ کا بیان ہے کہ سیدۂ عالمؑ نے رات بھر محراب عبادت میں کھڑے ہوکر نماز پڑھی اور مومنین ومومنات کے لیے بہت دعا کی مگر اپنے لیے کوئی دعا نہ مانگی۔ اس کا بعد میں شاہزادے نے آپ سے ذکر کیا تو فرمایا کہ الجار ثم الدار یہ عربی کی کہاوت ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ پڑوسی کا خیال گھر کی دیکھ بھال سے مقدم ہے۔

**پردہ:-** سیدۂ عالمؑ نہ صرف اپنی سیرت زندگی بلکہ اقوال سے بھی خواتین کے لیے پردہ کی اہمیت پر بہت زور دیتی تھیں۔ آپ کا مکان مسجد رسولؐ سے بالکل متصل تھا، لیکن آپ برقع و چادر میں نہاں ہوکر بھی اپنے والد بزرگوار کے پیچھے نماز جماعت میں شرکت یا آپ کے موعظہ کے سننے کے لیے مسجد میں تشریف نہیں لائیں بلکہ اپنے فرزند امام حسنؑ سے۔ جب وہ مسجد سے واپس جاتے تھے۔ اکثر رسولؐ کے خطبہ کے مضامین سن لیا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ پیغمبرؐ نے منبر پر یہ سوال پیش کردیا کہ عورت کے لیے سب سے بہتر کیا چیز ہے؟ یہ بات سیدہؑ تک پہونچی تو آپ نے جواب دیا کہ عورت کے لیے سب سے بہتر بات یہ ہے کہ نہ اس کی نظر کسی غیر مرد پر پڑے اور نہ کسی غیر مرد کی نظر اس پر پڑے۔ رسولؐ کے سامنے یہ جواب پیش ہوا تو حضرتؐ نے فرمایا ''کیوں نہ ہو فاطمہؑ میرا ہی ایک جزء ہے۔''

**خدمت اسلام:-** اسلامی تعلیم میں عورت کے جہاد کی نوعیت ہی مرد کے جہاد سے الگ رکھی گئی ہے لہٰذا حضرت فاطمہ زہراؑ بھی اسی کی پابند تھیں اس لیے کسی جہاد میں سیدۂ عالم کا میدانِ جنگ میں قدم رکھنا ثابت نہیں ہوتا، لیکن جس حد تک ان کے حدود عمل تھے ان میں جہادوں کے ذیل میں بھی غیر متعلق نہ تھیں مثلاً جنگ احد میں جب پیغمبر خدا صلی

اللہ علیہ وآلہ مدینہ واپس آئے اس حالت میں کہ چہرہ خون سے رنگین تھا تو سیدۂ عالم ہی تھیں جو ظرف میں پانی لے کر حاضر ہوئیں اور رسولؐ کا چہرہ دھلوایا۔ علی بن ابی طالبؑ آئے اس شان سے کہ شانوں تک دونوں ہاتھ دشمنوں کے خون سے رنگین تھے اور تلوار سے خون ٹپک رہا تھا۔ آپ نے تلوار فاطمہ زہراؑ کی طرف بڑھائی اور عجب فخر کے انداز میں کہا کہ لو یہ تلوار آج اس نے میرے ساتھ وفاداری کی حد کر دی، رسولؐ نے ارشاد کیا کہ لو فاطمہؑ علیؑ کے ہاتھوں سے تلوار کو لو آج تمہارے شوہر نے جو ان کا فرض تھا وہ بڑے نازک مرحلہ پر ادا کیا اور اللہ نے انہی کی تلوار سے قریش کے بڑے بڑے آدمیوں کا خاتمہ کرایا۔'' فاطمہ زہراؑ نے خاموشی کے ساتھ ان باتوں کو سنا، تلوار ہاتھ میں لی اور یقیناً ان باتوں سے انہوں نے خود بھی ایک طرح کا فخر محسوس کیا جس کے ساتھ انہیں ایسی عظیم منزل جہاد میں بذات خود شریک نہ ہونے کا کوئی افسوس بھی نہ تھا اس لیے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ ان کا جہاد یہی ہے جسے وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں رہ کے اسی طرح پورے طور پر ہمیشہ ادا کیا کرتی تھیں، جس طرح علیؑ نے ان جنگوں میں جہاد کا فرض ادا کیا۔ ہاں صرف ایک موقع عیسائیوں کے مقابلہ میں پر امن روحانی جہاد یعنی مباہلہ کا ایسا تھا جہاں سیدۂ عالم خدا کے حکم سے برقع و چادر میں نہاں ہو کر اپنے باپ اور شوہر کے ساتھ گھر سے باہر نکلیں جس کا واقعہ یہ تھا کہ یمن سے عیسائیوں کے علماء کا ایک وفد رسولؐ کے پاس بحث و مباحثہ کے لیے آیا اور کئی دن ان سے بحث ہوتی رہی جس سے حقیقت ان پر روشن تو ہو گئی مگر سخن پردازی کی بنا پر وہ قائل نہ ہونا تھے نہ ہوئے اس وقت قرآن کی آیت اتری کہ اے رسولؐ اتنے سچے دلائل کے بعد بھی یہ نہیں مانتے تو ان سے کہو کہ پھر آجاؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو، ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تم اپنی عورتوں کو، ہم اپنے نفسوں کو بلائیں تم اپنے اپنے نفسوں کو اور اللہ کی طرف رجوع کریں اور جھوٹوں کے لیے اللہ کی لعنت یعنی عذاب کی بددعا کریں۔'

'عیسائی علماء پہلے تو اس کے لیے تیار ہو گئے مگر جب رسول اللہؐ تشریف لے گئے اس شان سے کہ حسنؑ اور حسینؑ ایسے بیٹے، فاطمہ زہراؑ ایسی خاتون اور علیؑ ایسے نفس کو اپنے ساتھ لیے ہوئے تھے تو عیسائیوں نے مباہلہ سے انکار کر دیا اور مخصوص شرائط پر صلح کر کے واپس ہو گئے، اس طرح فاطمہ زہراؑ نے ثابت کر دیا کہ ان کا معیار پردہ بھی جس کی وہ پابند ہیں، بربنائے عادت نہیں بلکہ بربنائے فرض ہے، اس لیے کسی مستثنیٰ صورت میں اللہ کا حکم ظاہری صورت میں ان کے عام دستور زندگی کے خلاف فریضہ عائد کرے تو اس کی تعمیل بھی ان کے لیے ویسی ہی خوشگوار ہے جیسی اپنے عام دستور کی پابندی۔

**رسولؐ کا برتاؤ:-** حضرت فاطمہ زہراؑ کے اوصاف و کمالات ہی کا نتیجہ تھا کہ رسول فاطمہ زہرا کے ساتھ محبت بھی انتہائی فرماتے تھے اور آپ کی عزت بھی ایسی کرتے تھے جیسی اپنی بیٹی کی عزت کوئی دوسرا باپ نہیں کیا کرتا۔

محبت کے مظاہروں میں سے ایک یہ تھا کہ جب آپ کسی غزوہ پر تشریف لے جاتے تھے تو سب سے آخر

میں فاطمہ زہراؑ سے رخصت ہونے تشریف لاتے تھے اور جب واپس آتے تھے تو سب سے پہلے فاطمہ زہراؑ کے دیکھنے کو تشریف لاتے تھے۔

اور عزت و احترام کا مظاہرہ یہ ہے کہ جب فاطمہؑ آتی تھیں تو آپؐ تعظیم کو کھڑے ہوجاتے تھے، اور اپنی جگہ پر لاکر بٹھاتے تھے۔ یہ برتاؤ رسولؐ کا فاطمہ زہراؑ کے سوا کسی دوسرے شخص کے ساتھ نہ تھا۔

**فضائل :-** سیدۂ عالم کی فضیلت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتنی حدیثیں وارد ہیں جتنی حضرت علی ابن ابیطالبؑ کے سوا کسی دوسری شخصیت کے لیے نہیں ملتیں ان میں سے اکثر علمائے اسلام میں متفقہ حیثیت رکھتی ہیں، مثلاً آپ بہشت میں جانے والی عورتوں کی سردار ہیں، ایمان لانے والی عورتوں کی سردار ہیں، آپ کی رضا سے اللہ راضی ہوتا ہے اور آپ کی ناراضگی سے اللہ ناراض ہوتا ہے، جس نے آپ کو ایذا دی اس نے رسولؐ کو ایذا دی، آپ کا نام فاطمہؑ اس لیے ہوا کہ خدا نے آپ کی بدولت آپ کے دوست رکھنے والوں کو عذاب جہنم سے چھڑایا ہے۔ ''فطم'' کے معنی چھڑانے کے ہیں۔ فاطمہؑ کے معنی ہوئے ''چھڑانے والی'' اس طرح کی بکثرت حدیثیں ہیں جو معتبر کتابوں میں درج ہیں۔

**وفات رسولؐ :-** بعثت کے ۲۳ برس اور ہجرت کے دس برس بعد جب فاطمہ زہراؑ ۱۸ برس کی تھیں، آپ کے شفیق اور عزت کرنے والے قدردان باپ نے دنیا سے رحلت فرمائی، اس صدمہ کا اثر فاطمہ زہرا نے اتنا لیا جتنا کسی بیٹی نے کبھی اپنے باپ کی وفات کا اثر نہیں لیا ہے۔

**نوحہ و بکا :-** رسولؐ کی وفات کے بعد سیدۂ عالمؑ جتنے دن زندہ رہیں، کبھی کسی نے آپ کو ہنستے یا مسکراتے نہیں دیکھا بلکہ برابر باپ کے غم میں روتی رہیں۔ اور آپ اتنے پر درد طریقہ پر نوحہ کرتی تھیں کہ آس پاس کے رہنے والے بھی شدید طور متأثر ہوتے تھے۔

**ناگوار حالات :-** افسوس ہے کہ وہ فاطمہؑ جن کی تعظیم کو رسولؐ کھڑے ہوجاتے تھے، بعد رسولؐ اہل زمانہ کا رخ اپنی طرف سے پھرا ہوا محسوس کرتی تھیں۔ علی ابن ابیطالبؑ سے خلافت کا ہٹایا جانا ہی سیدہ کے لیے کیا کم تھا کہ آپ سے بیعت کا سوال بھی کیا جانے لگا اور صرف سوال ہی نہیں بلکہ جبر و تشدّد سے کام لیا جانے لگا انتہا ہے کہ سیدۂ عالمؑ کے گھر پر لکڑیاں جمع کر دی گئیں اور آگ لگائی جانے لگی۔ اس وقت کے صدمہ وزحمت کی شدت وہ تھی جسے جسمانی حیثیت سے سیدہ برداشت نہ کرسکیں اور وہی آپ کی وفات کا سبب ہوا، ان صدموں کی شدت سیدہ کی زبان پر جاری ہونے والے اس شعر سے ظاہر ہے کہ ؎

صبت علیّ مصائب لو انّها
صبت علی الایام صرن لیالیا

یعنی مجھ پر وہ مصیبتیں پڑیں ہیں کہ اگر وہ دنوں پر پڑتیں تو وہ رات ہوجاتے۔

**فدک :-** سیدہؑ کو جو جسمانی و روحانی صدمے پہونچے ان میں ایک بڑا اضافہ اس سے ہوگیا کہ فدک جائداد جو رسولؐ نے سیدہ عالمؑ کو مرحمت فرمائی تھی، اسے بعد رسولؐ ضبط کر لیا گیا۔ جائداد کا چلا جانا سیدہؑ کے لئے اتنی

تکلیف کا باعث نہ ہوسکتا تھا جتنا کہ آپ کے دعوے کو حکومت کی طرف سے غلط قرار دیا جانا۔ یہ وہ صدمہ تھا جس کا اثر سیدہ کے دل پر مرتے دم تک رہا۔

**وصیتیں :-** حضرت فاطمہ زہراؑ نے طبقۂ خواتین کے لئے پردہ کی یادگار اہمیت اس وقت بھی قائم کی جب آپ دنیا سے رخصت ہونے والی تھیں اس طرح کہ آپ ایک دن غیر معمولی طور پر فکر مند نظر آئیں آپ کی چچی (جعفر طیار کی بیوہ) اسما بنت عمیس نے سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے جنازہ اٹھانے کا یہ دستور اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ عورت کی میت کو بھی تختہ پر اٹھایا جاتا ہے جس سے اس کا قدو قامت نظر آتا ہے۔ اسماء نے کہا میں نے ملک حبشہ میں ایک طریقہ جنازہ اٹھانے کا دیکھا ہے وہ غالباً آپ کو پسند ہوگا۔ اس کے بعد انہوں نے تابوت کی ایک شکل بنا کر دکھائی اس پر سیدۂ عالمؑ بہت خوش ہوئیں اور پیغمبرؐ کے بعد صرف یہ ایک موقع ایسا تھا کہ آپ کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی چنانچہ آپ نے وصیت فرمائی کہ آپ کو اسی طرح کے تابوت میں اٹھایا جائے مؤرخین تصریح کرتے ہیں کہ سب سے پہلی لاش جو تابوت میں اٹھی ہے وہ حضرت فاطمہ زہراؑ کی تھی اس کے علاوہ آپ نے یہ وصیت بھی فرمائی تھی کہ آپ کا جنازہ پردۂ شب میں اٹھایا جائے اور ان لوگوں کو اطلاع نہ دی جائے جنکے طرز عمل نے آپ کے دل میں زخم ڈال دیے تھے اور جن سے انتہائی ناراضگی کے عالم میں آپ دنیا سے رخصت ہوئیں

**وفات :-** آخر سیدۂ عالمؑ نے اپنے والد بزرگوار رسولؐ خدا کی وفات کے ۳مہینہ بعد تیسری جمادی الثانیہ ۱۱ھ میں وفات پائی۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کا جنازہ رات کو اٹھایا گیا۔ حضرت علیؑ ابن ابیطالب نے تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ صرف بنی ہاشم اور سلمان اور مقداد و عمار ایسے چند مخلصین کے ساتھ نماز جنازہ ادا کی اور خاموشی کے ساتھ دفن کر دیا آپ کے محل دفن کی اطلاع بھی عام طور سے لوگوں کو نہیں ہوئی جس کی بنا پر یہ اختلاف رہ گیا کہ آپ جنت البقیع میں دفن ہیں یا اپنے ہی مکان میں جو بعد کو مسجد رسول کا جزو بن گیا۔ جنت البقیع میں جو آپ کا روضہ تھا وہ بھی باقی نہیں رہا بلکہ ۸رشوال ۱۳۴۴ھ کو ابن مسعود نے دوسرے مقابر اہل بیتؑ کے ساتھ اسے بھی منہدم کر دیا۔

**بقیہ: مسلمانوں کے درمیان۔۔۔۔**

ثبوت میں خدا کی شہادت یعنی قرآن مجید کی رو سے اپنی نبوت کا اعلان کرے: قُلْ كَفىٰ بِاللّٰهِ شَهِيْداً بَيْنِي وَبَيْنَكُم (رعد ۴۳) ترجمہ: اے نبیؐ کہہ دے کہ میرے اور تمہارے درمیان میری نبوت اور پیغمبری کے متعلق خود خدا کی شہادت کافی ہے۔

ایک اور جگہ (قرآن مجید) میں خداوند کریم کی شہادت کے علاوہ فرشتوں کی شہادت بھی ہے: لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَا اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ وَالْمَلَائِكَةُ يَشْهَدُوْنَ وَكَفىٰ بِاللّٰهِ شَهِيْداً (نساء ۱۶۶)

ترجمہ: لیکن خداوند تعالیٰ نے جو چیز تجھ پر نازل کی ہے اس کے متعلق خود بھی شہادت دیتا ہے اور فرشتے بھی شہادت دیتے ہیں اور صرف خداوند تعالیٰ کی شہادت کافی ہے۔

❀❀❀

# امام محمد باقر علیہ السلام اور سیاسی جدو جہد

آیت اللہ العظمٰی سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی

ترجمہ: جناب مولانا سید ولی الحسن رضوی صاحب

**امام باقرؑ کا عہد:-** ہمارے پانچویں امام محمد باقر علیہ السلام کا دور آتا ہے حضرت کی زندگی بھی امام چہارم کے خطوط پر ہی کاربند نظر آتی ہے جناب سید سجادؑ نے اپنا کام جس منزل پر چھوڑا تھا آپ اسی کام کو مزید آگے بڑھاتے ہیں فرق اتنا ہے کہ اب نسبتاً حالات کچھ بہتر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ امام باقرؑ بھی معارف اسلامی اور تعلیمات محمدیؐ پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اور چونکہ اب لوگ خاندان پیغمبر کی طرف سے پہلے جیسی بے اعتنائی وسردمہری نہیں برتتے لہٰذا جب امام وارد مسجد ہوتے ہیں کچھ لوگ ان کے اردگرد حلقہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور آپ کے وجود ذی جود سے استفادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام کو مسجد مدینہ میں اس عالم میں دیکھا کہ ''و حوله اهل خراسان و غيرهم'' خراسان نیز دیگر دور دراز علاقوں سے تعلق رکھنے والے افراد آپ کے چاروں طرف جمع تھے اس سے پتہ چلتا ہے کہ تبلیغات کا اثر اب کسی موج کی مانند پوری اسلامی دنیا میں پھیلاؤ پیدا کر رہا تھا۔ دور دور کے لوگ اہلبیتؑ سے نزدیک ہو رہے تھے۔ ایک دوسری روایت کے الفاظ یوں ہیں ''احتوشه اهل خراسان'' یعنی اہل خراسان آپ کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھے اور حضرت ان لوگوں سے حلال وحرام سے متعلق مسائل بیان فرماتے رہتے تھے۔

اس وقت کے بڑے بڑے علماء آپ کے علم سے فیضیاب ہوتے تھے۔ عکرمہ جیسی مشہور ومعروف شخصیت جو ابن عباس کے شاگردوں میں سے تھی جس وقت امامؑ کی خدمت میں پہونچی تا کہ آپ سے حدیث سنے (اور شاید امام کا امتحان لینا بھی مقصود رہا ہو!) تو ہاتھ پاؤں میں ایک تھرتھری سی پڑ گئی اور بے تحاشہ طور پر خود کو امامؑ کی آغوش میں گرا دیا۔ بعد میں اپنی حالت پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے عکرمہ کہتے ہیں: میں نے ابن عباس جیسے بزرگ کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے حدیث بھی سنی مگر اے فرزند رسولؐ! آپ کی خدمت میں پہونچکر میری جو کیفیت ہوئی اس حالت سے کبھی بھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ آپ ملاحظہ فرمائیں جواب میں حضرتؑ کتنی وضاحت کے ساتھ فرماتے ہیں:-

**''ويحک يا عبيد اهل الشام انک بين يدی بيوت اذن الله ان ترفع و يذكر فيها اسمه''**

اے حکومت شام کے بندۂ بے دام! اس وقت تو ایک معنوی عظمت کے روبرو کھڑا ہے یہی وجہ ہے کہ تیرے ہاتھ پاؤں تیرے قابو میں نہیں ہیں۔

امامؑ کی خدمت میں ابوحنیفہ جیسی شخصیت جن کا اپنے دور کے صاحب نظر فقہاء میں شمار ہوتا ہے احکام دین اور معارف اسلام کی تحصیل کے لئے حاضری دیتی نظر آتی

ہے۔ ان کے علاوہ بھی دوسرے بہت سے بڑے بڑے علماء کے نام حضرت کے شاگردوں کی طویل فہرست میں نظر آتے ہیں۔ حضرتؑ کا علمی شہرہ اطراف واکناف عالم تک پہونچ چکا تھا اسی وجہ سے آپ باقر العلوم کے نام سے مشہور ہوئے۔

اب معاشرے کی حالت اور لوگوں کے دلوں میں ائمہ علیہم السلام کے تئیں احترام ومحبت کا جذبہ امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانہ میں اس حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔ اسی مناسبت سے امام کی سیاسی جدوجہد میں بھی تیزی نظر آتی ہے یعنی جناب سید سجادؑ عبدالملک بن مروان کے مقابلہ میں کبھی کوئی سخت اور درشت لب ولہجہ اپنانا بھی چاہتے تو اس وقت کے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اگر عبدالملک سید سجادؑ کو کسی موضوع پر خط لکھتا ہے اور حضرت اس کا جواب دیتے ہیں تو اگرچہ فرزند نبیؐ کا جواب ہمیشہ ہر رخ سے محکم و متین اور دنداں شکن ہوتا ہے پھر بھی اس میں کوئی صریحی مخالفت اور تعرض کا انداز نظر نہیں آتا۔ لیکن امام محمد باقر علیہ السلام کا مسئلہ دوسرے ہی انداز کا ہے آپ کی جدوجہد کا طریقہ کار اتنا واضح ہے کہ اسے دیکھ کر ہشام بن عبدالملک خوف وہراس کا احساس کرتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ امام پر نظر رکھنا ضروری ہے چنانچہ وہ آپ کو شام لے جانا چاہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سید سجاد کو بھی آپ کی امامت کے دوران (حادثۂ کربلا اور اسیری اہل حرم کے بعد دوبارہ) قید کر کے پابہ زنجیر شام لے جایا گیا ہے لیکن وہ دوسری نوعیت تھی اور سید سجادؑ ہمیشہ بڑے ہی احتیاط کے ساتھ اقدامات کیا کرتے تھے جبکہ امام محمد باقر علیہ السلام کی گفتگو کا لہجہ سخت نظر آتا ہے۔ میں نے چند روایتیں دیکھی ہیں جن میں امام باقرؑ اپنے اصحاب سے مذاکرہ فرماتے ہوئے ان کو حکومت وخلافت اور امامت ورہبری کی دعوت ہی نہیں بلکہ مستقبل قریب میں اس کے قیام کی خوشخبری دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک روایت بحار میں اس مضمون کے ساتھ نقل کی گئی ہے:-

حضرت ابی جعفر (امام باقرؑ) کا بیت الشرف جمعیت سے پر ہے ایک بوڑھا شخص عصا پر تکیہ کیے ہوئے آتا ہے اور سلام واظہار محبت کے بعد حضرت کے بغل میں بیٹھ جاتا ہے اور یوں گویا ہوتا ہے: ''**فو اللہ انی لاحبکم احب من یحبکم فو اللہ ما احبکم و احب من یحبکم لطمع فی دنیا و اننی لابغض عدوکم و ابرء منہ فو اللہ ما ابغضہ و ابرء منہ لوترٍ کانت بینی و بینہ و اللہ انی لاحل حلالکم و احرم حرامکم و انتظر امرکم فھل ترجو لی جعلنی اللہ فداک۔**''

خدا کی قسم میں آپ کو دوست رکھتا ہوں اور اس کو بھی دوست رکھتا ہوں جو آپ کو دوست رکھتا ہے اور خدا کی قسم یہ دوستی دنیاوی مفادات کی لالچ کی خاطر نہیں ہے۔ اور بے شک میں آپ کے دشمنوں سے بغض رکھتا ہوں اور ان سے برائت چاہتا ہوں اور خدا کی قسم یہ دشمنی ان سے ذاتی عداوت یا بدلہ کے باعث نہیں ہے۔ خدا کی قسم میں نے اس شئے کو حلال سمجھا ہے جس کو آپ نے حلال قرار دیا اور اس کو حرام سمجھا ہے جس کو آپ نے حرام قرار دیدیا ہے میں آپ

کے امر کا منتظر ہوں پس میں آپ پر فدا ہو جاؤں کیا آپ کی کامیابی کے دن میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا۔

اس روایت میں آخری جملہ غور طلب ہے، آنے والا امامؑ سے سوال کرتا ہے کہ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کی کامیابی کے دن اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا؟ کیونکہ میں آپ کے امر یعنی آپ کی حکومت کے دیکھنے کا منتظر ہوں اس دور میں 'امر' یا ہٰذ الامر یا امرکم کی تعبیر حکومت کے معنی میں ہے۔ اس طرح کی تعبیریں کیا ائمہ اور ان کے اصحاب اور کیا ان کے مخالفین ہر ایک کے درمیان ان ہی معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔ چنانچہ مامون رشید سے گفتگو کرتے ہوئے ہارون کہتا ہے:-

**واللّٰہ لو تنازعت معی فی ھذا الامر**

ظاہر ہے یہاں ھذا الامر سے خلافت وامامت ہی مراد ہے۔ لھٰذا انتظر امر کم کا مطلب امام کی حکومت و خلافت کا انتظار ہے۔ بہرحال وہ شخص سوال کرتا ہے کہ مولا! کیا آپ کو امید ہے کہ میں اس وقت تک زندہ رہوں گا اور آپ کی حکومت اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں گا؟

**''فقال ابو جعفر :الیّ الیّ حتیٰ اقعدہ علیٰ جنبہ''** امامؑ نے اس کو اپنے قریب بلایا اور اپنے بغل میں جگہ عنایت فرمائی۔ **ثم قال : ایھا الشیخ ان علی بن الحسین علیہ السلام اتاہ رجل فسأله عن مثل الذی سئلتنی عنہ''**

یعنی امامؑ فرماتے ہیں بعینہ یہی سوال امام زین العابدینؑ سے بھی کیا گیا تھا۔ البتہ مجھے سید سجادؑ سے مروی روایتوں میں اس طرح کی عبارت نہ مل سکی چنانچہ اگر سید سجادؑ کے سامنے بھی اس قسم کی گفتگو مجمع عالم میں ہوئی تھی تو دوسرے بھی اس سے واقف ہوتے اور بات ہم تک بھی ضرور پہنچتی لھٰذا گمان غالب یہ ہے کہ امام سجادؑ نے جو بات پردۂ راز میں رکھتے ہوئے فرمائی ہے، یہاں امام باقر علیہ السلام نے وہی بات علی الاعلان ارشاد فرمائی ہے۔ امام فرماتے ہیں:-

**ان تمت ترد علیٰ رسول اللّٰہ وعلیٰ علی والحسن والحسین و علی بن الحسین و یثلج قلبک و یبرد فؤداک و تقر عینک و تستقبل الروح والریحان مع الکرام الکاتبین و ان تعش تری مایقر اللّٰہ بہ عینک وتکون معنا فی السنام الاعلیٰ''**

امامؑ اپنے اس صحابی کو مایوس نہیں کرتے فرماتے ہیں: اگر موت آ گئی تو پیغمبر اسلام اور اولیاء کرام کی معیت سے شرفیاب ہو گے اور اگر زندہ رہے تو ہمارے ساتھ رہو گے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کے کلام میں اس طرح کی تعبیرات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ امام علیہ السلام اپنے شیعوں کو مستقبل کے بارہ میں پر امید رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک دوسری روایت جو کافی میں نقل کی گئی ہے وقت قیام کی بھی نشاندہی کرتی ہے اور بظاہر یہ چیز بڑی عجیب سی لگتی ہے:

**عن ابی حمز□ الثمالی بسندعالٍ:قال سمعت ابا جعفر (ع) یقول: ان اللّٰہ تبارک وتعالیٰ قد وقّت ھٰذا الامر فی السبعین فلما ان قتل الحسین (ع)**

**اشتد غضب اللّٰہ تعالیٰ علی اھل الارض فاخرہ الیٰ اربعین و مائۃ و حدثنا کم و اذعتم الحدیث فکشفتم قناع الستر و لم یجعل اللّٰہ لہ بعد ذالک وقتاً عندنا۔ و یمحو اللّٰہ مایشاء و یثبت و عندہ ام الکتاب''**

ابوحمزہؒ ثمالی امام محمد باقرؑ سے روایت کرتے ہیں کہ: خداوند عالم نے ۷۰ھ کو حکومت علوی کی تشکیل کے لئے مقدر فرمایا تھا لیکن امام حسین علیہ السلام کے قتل نے خداوند عالم کو لوگوں کی طرف سے اتنا خشمگیں کر دیا کہ اس وقت کو ۱۴۰ھ تک ملتوی کر دیا۔ اور پھر ہم نے تم کو اس وقت کی خبر دی اور تم نے افشاء کر دیا اور پردۂ راز میں نہ رکھ سکے لہٰذا اب پروردگار عالم نے ہم کو اس وقت کی کوئی خبر نہیں دی ہے خدا کسی بھی چیز کے بارے میں جیسا چاہتا ہے محو یا اثبات کر دیتا ہے دفتر تقدیر اسی کے پاس ہے۔

ابوحمزہؒ ثمالی کہتے ہیں:-

**''فحدثت بذالک ابا عبداللّٰہ (ع) فقال قد کان کذالک۔''**

میں نے امام صادق علیہ السلام کی خدمت میں اس کا تذکرہ کیا، آپ نے فرمایا: ہاں ایسا ہی تھا۔

۱۴۰ھ امام صادق علیہ السلام کی زندگی کا آخری دور ہے اور یہ وہی چیز ہے جو اس حدیث مبارکہ کے دیکھنے سے قبل ہی ائمہ علیہم السلام کے حالات زندگی سے میں نے ماخوذ کر لی تھی چنانچہ میری نظر میں وہ ممکنہ حکومت جس کے لئے امام سجادؑ نے اس انداز سے امام باقرؑ نے اس انداز سے جدوجہد کی اصولی طور پر امام جعفر صادقؑ کے زمانہ میں قائم ہوجانی چاہئے تھی کیونکہ امام صادقؑ کی شہادت ۱۴۸ھ میں ہوئی ہے اور خدا کی طرف سے تاسیس حکومت کا وعدہ ۱۴۰ھ کے لئے تھا اور ۱۴۰ھ کی اہمیت ۱۳۵ھ کے بعد کے دنوں کی اہمیت کے ذیل میں پیش کیے گئے ہمارے معروضہ سے ظاہر ہے یعنی یہی وہ وقت ہے جب عباسی خلیفہ منصور برسر اقتدار آیا ہے۔ اگر منصور برسر اقتدار نہ آتا اور بنو عباس کا حادثہ تاریخ میں رونما نہ ہوتا تو حالات یقیناً کچھ اور ہوتے۔ گویا حالات کے تحت تقدیر الٰہی یہی تھی کہ ۱۴۰ھ میں ایک الٰہی اسلامی حکومت قائم ہوجانی چاہئے تھی اب یہ ایک دوسری بحث ہے کہ آیا آئندہ کے سلسلہ میں خود ائمہ علیہم السلام کی بھی توقعات بندھی ہوئی تھیں اور وہ اس دن کے منتظر تھے یا کہ وہ پہلے سے جانتے تھے کہ قضاء الٰہی کچھ اور ہی ہوگی؟ فی الحال ہم اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے ممکن ہے ایک مستقل موضوع کے تحت اس پر بحث کی جائے۔

ابھی تو ہماری بحث امام محمد باقر علیہ السلام کے حالات کے سلسلہ میں ہے کہ آپ واضح الفاظ میں تصریح کر دیتے ہیں کہ ۱۴۰ھ نظام الٰہی کی تشکیل کے لئے معین تھا لیکن چونکہ ہم نے اس کی تم کو خبر دے دی اور تم اس کو پردۂ راز میں نہ رکھ سکے لہٰذا خداوند عالم نے اس میں تاخیر کر دی۔ اس طرح کی امید بندھانا اور وعدے کرنا امام محمد باقرؑ کے دور کا اہم امتیاز ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام کی زندگی کے سلسلہ میں بھی کئی گھنٹوں بحث کئے جانے کی ضرورت ہے تا کہ آپ کی زندگی کے مختلف گوشے اجاگر کئے جاسکیں میں اس سلسلہ میں

بھی طولانی بحثیں کر چکا ہوں مختصر یہ کہ حضرت کی زندگی میں سیاسی جدوجہد کے عنصر بالکل واضح ہیں اگرچہ آپ مسلحانہ مبارزہ کے حق میں نظر نہیں آتے۔ چنانچہ آپ کے بھائی زید ابن علی جب آپ سے مشورہ کرتے ہیں تو حضرتؑ فرماتے ہیں :''قیام نہ کرو'' اور جناب زید آپ کی اطاعت کرتے ہوئے خاموش ہوجاتے ہیں اور یہ جو دیکھنے میں آتا ہے کہ کچھ لوگ جناب زید کی اہانت پر اتر آتے ہیں کہ امامؑ نے قیام سے منع کیا تھا پھر بھی جناب زید اٹھ کھڑے ہوئے اور امام کی اطاعت نہیں کی یہ ایک غلط تصور ہے۔ امام باقر علیہ السلام کے منع کرنے کے بعد جناب زید نے امام کی اطاعت کی اور قیام نہ کیا اور جب امام صادق کا دور آیا تو انہوں نے دوبارہ امام صادقؑ سے مشورہ کیا۔ امامؑ نے قیام سے منع نہیں کیا بلکہ اس سلسلہ میں حوصلہ افزائی بھی کی یہی وجہ ہے کہ جناب زید کی شہادت کے بعد بھی امام صادقؑ آرزو کرتے ہیں کہ کاش میں بھی زید کے ساتھیوں میں ہوتا۔ لہٰذا کسی بھی طرح جناب زید کے ساتھ یہ اہانت آمیز برتاؤ درست نہیں ہے۔

بہرحال امام محمد باقر علیہ السلام نے مسلحانہ قیام قبول نہ کیا لیکن آپ کی زندگی میں سیاسی مبارزہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اور آپ کی سیرت کا مطالعہ کرتے وقت بخوبی اس کا احساس کیا جاسکتا ہے جبکہ سید سجادؑ کی زندگی میں سیاسی مبارزہ اس صراحت کے ساتھ نظر میں نہیں آتا۔

جب اس عظیم ہستی کا دور حیات آخری منزلوں پر پہونچنے لگتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ حضرتؑ اپنے سیاسی مبارزہ کو میدان منیٰ میں عمومی عزاداری کا رنگ دیکر جاری رکھتے ہیں آپ وصیت کرتے ہیں کہ دس برس تک منیٰ میں سوگ کے طور پر آپ پر گریہ کیا جائے (تندبنی النوادب بمنیٰ عشر سنین) یہ دراصل اسی سیاسی جدوجہد کے جاری رکھنے کا ایک طریقہ ہے۔ امام محمد باقرؑ پر گریہ کیا جانا اور وہ بھی منیٰ میں آخر اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ ائمہ علیہم السلام کی زندگانی میں عام طور پر امام حسین علیہ السلام پر گریہ کے سلسلہ میں ضرور حکم ملتا ہے، چنانچہ اس ذیل میں یقینی روایات موجود ہیں لیکن اور کسی کے سلسلہ میں مجھے یاد نہیں کہ اس طرح کا حکم دیا گیا ہو، الّا یہ کہ امام رضاؑ کے بارے میں اتنا ملتا ہے کہ آپ جب وطن سے رخصت ہونے لگے تو اپنے اہل خاندان کو جمع کیا تاکہ آپ پر گریہ کریں اور یہ اقدام مکمل طور پر سیاسی نوعیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ امام کی رحلت سے قبل کا واقعہ ہے۔ امام حسینؑ کے بعد یہ محض امام محمد باقر علیہ السلام کے سلسلہ میں شہادت کے بعد اس طرح کے گریہ کا حکم نظر آتا ہے امام وصیت کرتے ہیں اور آٹھ سو درہم اپنے پاس سے دیتے ہیں کہ یہ کام منیٰ میں انجام دیا جائے۔ منیٰ، عرفات و مشعر بلکہ خود مکہ سے بھی فرق رکھتا ہے۔

مکہ میں حاجی متفرق رہتے ہیں ہر شخص اپنے اپنے کام میں مشغول رہتا ہے عرفات کا قیام زیادہ سے زیادہ صبح سے عصر تک رہتا ہے صبح جب لوگ پہونچتے ہیں تھکے ہوئے ہوتے ہیں اور عصر کے وقت واپسی کی جلدی رہتی ہے تاکہ اپنے کام انجام دے سکیں۔ مشعر میں شب کے وقت چند گھنٹوں کا قیام رہتا ہے۔ منیٰ جاتے ہوئے اس کی ایک گزرگاہ کی حیثیت ہے لیکن منیٰ میں مسلسل طور پر تین راتیں

گذارنی ہوتی ہیں ایسے بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو اس درمیان اپنے دن مکہ میں اور راتیں منیٰ میں گذارتے ہوں۔ زیادہ تر لوگ وہیں ٹھرتے ہیں خاص طور سے اس زمانے میں جبکہ وسائل سفر بھی آسانی سے مہیا نہ ہوتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت عالم اسلام کے مختلف گوشوں سے تعلق رکھنے والے ہزاروں افراد تین شبانہ روز ایک ہی جگہ جمع رہتے تھے ہر شخص بآسانی درک کر سکتا ہے کہ اس سے بہتر کوئی دوسری جگہ تبلیغات کے لئے نہیں مل سکتی جو پیغام بھی پورے عالم اسلام میں پہونچانا مقصود ہو یہاں سے بخوبی نشر کیا جا سکتا ہے ۔خصوصاً ایک ایسے دور میں جبکہ آج کی طرح ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبار یا اسی طرح کے دوسرے وسائل ابلاغ موجود نہ تھے۔ جب کچھ لوگ اولاد پیغمبر میں سے ایک فرد پر گریہ و زاری کرتے نظر آتے، اصولی طور پر لوگوں کے دلوں میں سوال اٹھتا کہ ان لوگوں کی اشک ریزی کا کیا سبب ہے، ہر ایک مرنے والے پر اتنی مدت تک اس شدت کے ساتھ گریہ وزاری نہیں ہوتی مگر یہ کہ اس پر ظلم ہوا ہو یا اس کو ظالموں نے قتل کیا ہو؟ کس نے آل محمدؐ پر ظلم کیا؟ ان پر کیوں ظلم کیا گیا؟ اس طرح کے بے پناہ سوالات پیدا ہوتے اور یہ وہی سیاسی جدو جہد ہے جس کا بہت ہی دقیق طور پر اندازہ کرتے ہوئے امام کی طرف سے حکم دیا گیا ہے۔

امام محمد باقرؑ کی سیاسی زندگی کا مطالعہ کرتے وقت ایک نکتہ کی طرف میری توجہ مبذول ہوئی وہ یہ کہ اپنی خلافت کے حق میں استدلال کا جو طریقہ پہلی صدی ہجری کے نصف اول میں اہلبیت علیہم السلام کی زبان پر جاری رہا ہے امام علیہ السلام بھی اسی کی تکرار کرتے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ وہ طریقۂ استدلال یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے عرب ہونے کی بنیاد پر عرب عجم پر فخر کرتے ہیں، قریش غیر قریش پر فخر کرتے ہیں۔ اگر ان کا فخر کرنا صحیح ہے تو ہم تو پیغمبرؐ کے خاندان اور اولاد سے ہیں لہٰذا سب پر اولیت رکھتے ہیں اور حال یہ ہے کہ ہم کو اس حق سے محروم کر کے دوسرے اپنے آپ کو پیغمبر کی حکومت کا وارث قرار دئے بیٹھے ہیں اگر پیغمبر کی قربت قریش کو غیر قریش پر اور عرب کو غیر عرب پر ممتاز ومفتخر قرار دیتی ہے تو یہ دوسروں پر ہماری برتری اور اولویت کو بھی ثابت کرتی ہے۔ یہ وہ استدلال ہے جو ابتدائی دور میں بارہا اہلبیت علیہم السلام کی زبان پر جابجا جاری ہوا ہے اور اب دوبارہ ۹۵ھ سے ۱۱۴ھ کے درمیان امام محمد باقرؑ اپنے عہد امامت میں ان کلمات کی تکرار فرماتے ہیں اور اپنی خلافت کے لئے اس طور پر استدلال کرنا بڑی معنویت رکھتا ہے۔

ارشادات امام محمد باقر علیہ السلام:-

- علم حاصل کرو تاکہ لوگ تمہیں پہچانیں اور اس پر عمل کرو تاکہ تمہارا شمار علماء میں ہو۔
- عبادت الٰہی کا خاص خیال رکھو، عمل خیر میں جلدی کرو، برائیوں سے اجتناب کرو۔
- تین برائیاں ایسی ہیں کہ ان کا انجام دینے والا ان کے برے اثرات کو دیکھ کر ہی اس دنیا سے اٹھتا ہے:
- ان میں سے پہلی برائی ظلم دوسری قطع رحمی اور تیسری جھوٹی قسم ہے۔

# حضرت فاطمہؑ اسوۂ جاوید

عماد العلماء علامہ ڈاکٹر سید علی محمد نقوی مدظلہ

حضرت فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا پیغمبر اسلام کی دختر ارجمند ہیں جن سے رسول اکرمؐ کی ذریت و نسل طاہر دنیا میں باقی ہے، حضرت علیؑ شیر خدا کی زوجہ اور شیعوں کے گیارہ اماموں کی مادر گرامی ہیں، ان کے اسوۂ حمیدہ کو اسلام نے خواتین کے لئے نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔

اسلام نے محض کتاب اور شریعت پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ بعض شخصیتوں کو منتخب کیا ہے کہ وہ کتاب کی تعلیم اسلام کی روح اور اس کے جوہر کو اپنے کردار و عمل کی صورت میں پیش کریں۔ پیغمبر اور بارہ امام اسی اسوۂ حسنہ کے حامل ہیں۔

خدائے تعالیٰ نے مرد و عورت کو مختلف خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ بہت سی خصوصیتیں عورتوں میں ایسی ہیں جو مردوں میں نہیں ہیں۔ پیغمبر اور ائمہ کے لئے ضروری تھا کہ خواتین کے لئے بھی نمونہ عمل پیش کرتے ایک ایسی ہستی جو اپنے کردار و عمل سے ہر قدم اور ہر آن یہ بتائے کہ ایک مسلمان خاتون کو کیسا ہونا چاہئے۔ ایک عورت کا رابطہ باپ سے، شوہر سے، اولاد سے، معاشرہ سے اور اجتماعی اور سیاسی زندگی سے کیسا ہونا چاہئے۔ چنانچہ جناب فاطمہ زہرا (س) ایسی ہی ہستی ہیں جنہیں اسلام نے ایک مثالی خاتون کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اسی وجہ سے پیغمبر اسلام نے جناب فاطمہ زہرا (س) سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا

''مریم اپنے زمانہ کی اعلیٰ ترین خاتون تھیں مگر تم ہر زمانہ اور ہر صدی کی اعلیٰ ترین خاتون ہو۔''

اس طرح جناب فاطمہ زہرا (س) اپنے اسوہ ہائے حسنہ کے ساتھ کل خواتین کے لئے ایک نمونہ اور تمثیل ہیں۔ عباس محمود العقاد نامور مصری محقق بھی اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

''ہر دین میں ایک ایسی مقدس اور کامل خاتون کا وجود ہوتا ہے جسے اس دین کے ماننے والے خداوند تعالیٰ کی نشانی سمجھتے ہوئے اس کی تقدیس کے معتقد ہوتے ہیں، مثلاً دینِ مسیح میں جناب مریم کا وجود مقدس اور افضل مانا گیا ہے اسی طرح اسلام میں حضرت زہرا (س) ایک مثالی خاتون ہیں۔''

ہر دین میں ایک عورت اس دین کی تعلیمات اور خصوصیات کا عملی مظہر ہوتی ہے۔ بعنوان نمونہ آپ تبدیل شدہ مسیحیت کو ملاحظہ فرمائیں چونکہ یہ ایک ایسا دین ہے جو رہبانیت، عزلت نشینی اور معاشرے سے بے تعلق ہو کر معنویت اور روحانیت سے منسلک رہنے کا عقیدہ پیش کرتا ہے اس لئے اپنے مذہب کی مثالی خاتون، یعنی مریم عذرا کی جو شکل مسیحی پیش کرتے ہیں وہ ان ہی خصوصیات کی حامل ہے۔

لیکن اسلام ایک ایسا دین ہے جس کے متعدد پہلو

ہیں اسلام میں معنویت، اجتماعی وسیاسی زندگی سے تعلق عبادت، خاندانی اور گھریلو ذمہ داریاں، عرفان، جہاد غرضکہ زندگی کا ہر رخ موجود ہے۔ حضرت زہرا(س) جو اسلام میں ایک مثالی خاتون ہیں جن کی پاکیزہ سیرت تمام مسلمان خواتین کے لئے نمونہ ہے آپ نے اپنی زندگی میں دین اسلام کے ہر رخ کو پیش فرمایا ہے۔ اکثر علماء ومحققین مثلاً تقی سبکی، جلال سیوطی، زرکشی اور تقی مقریزی تمام دنیا کی خواتین پر حضرت فاطمہ زہرا(س) کی افضلیت اور ان کے کردار اور مثالی سیرت کے معترف ہیں اور اس کا نمایاں طور پر ذکر بھی فرمایا ہے۔ چنانچہ تقی سبکی جو علماء اہلسنت میں سے ہیں اور اس سوال کا کہ ''اسلام میں افضل ترین خاتون کون ہیں؟'' یوں جواب دیتے ہیں: ''میرا اعتقاد ہے کہ فاطمہ(س) دختر محمد صلعم ساری دنیا کی عورتوں میں افضل ترین خاتون ہیں۔'' ابن داؤد نے بھی اس سوال کے جواب میں کہا ہے کہ ''جب پیغمبرؐ خدا نے جناب فاطمہ(س) کو اپنے جسم کا ایک ٹکڑا کہا ہے تو اب اس کے بعد کسی اور کا ان سے افضل ہونا قطعی ناممکن ہے اس لئے کہ پیغمبرؐ کے جسم کے ٹکڑے پر کسی کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

معتبر احادیث واخبار کے مطابق پیغمبر اسلام نے خود جناب فاطمہ زہرا(س) کو ''دنیا کی تمام عورتوں کی سردار'' کہا ہے اور ان کی پاکیزہ سیرت کو خواتین عالم کے لئے تاریخی نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اہل سنت کی معتبر کتابوں میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسولِؐ خدا نے جناب فاطمہ سے کہا ''جان پدر، فاطمہ کیا تم اس بات پر خوش نہیں ہو کہ تم تمام خواتین سے افضل اور میری پوری امت کی خواتین کی سردار ہو اور باایمان عورتوں میں سب سے برتر ہو؟''

عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسولؐ خدا نے جناب فاطمہ(س) سے پوچھا ''اے جان پدر! کیا تمہیں یہ جان کر خوشی نہیں ہوئی کہ تم تمام عالم کی خواتین میں سب سے افضل وبرتر ہو؟'' جواب میں جناب فاطمہ(س) نے سوال کیا کہ ''اگر میں سب سے افضل ہوں تو مریم بنت عمران کیا ہیں؟'' رسولؐ اللہ نے فرمایا وہ صرف اپنے دور کی خواتین میں سب سے افضل ہیں اور تم ہر دور کی خواتین میں سب سے افضل ہو'' اس طرح جناب فاطمہ زہرا(س) تمام دنیا کی خواتین کے لئے ایک مثالی خاتون اور اسوۂ جاوید ہیں

انہوں نے نمونہ پیش کیا ہے کہ ایک مسلمان خاتون کو کس طرح روحانیت سے بھی متعلق رہنا چاہیے اور خاندان کی ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہونا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ اجتماعی حقیقی جہاد میں بھی شامل رہنا چاہیے۔ حضرت فاطمہ زہراؑ کی زندگی میں ہم عرفان، امور خانہ کی انجام دہی اور اجتماعی واعتقادی جہاد تینوں پہلوؤں کو اپنے عروج پر پاتے ہیں۔

مباہلہ جناب زہرا(س) کے معنوی وعرفانی مقامات کی رفعت کی ایک سندِ جاوید ہے مباہلہ کے تاریخی واقعات میں نجران کے نصاریٰ جو عبادت وریاضت میں مشہور تھے ان سے مقابلہ کرنے کے لئے روحانی ومعنوی اعتبار سے پورے گروہ اسلامی میں سے صرف پانچ افراد کو منتخب کیا گیا اور ان پانچ روحانی افراد میں سے ایک فرد جناب فاطمہ

زہرا(س) ہیں ۔نصاریٰ اپنی معنوی قوت پر بہت نازاں تھے مگران خدائی ہستیوں کے مقابل ٹھرنے کی جرأت نہ کر سکے ابوحارث اسقف مباہلہ سے روگرداں ہوگیا۔ جب اس کے ساتھیوں نے اس سے پوچھا کہ ''تونے محمد(صلعم) سے مباہلہ کا خیال ترک کیوں کر دیا؟'' تو اس نے جواب دیا ''خدا کی قسم میں انے ایسے چہرے دیکھے جو اگر دعا مانگیں تو پہاڑ حرکت میں آجائیں اور اگر ہمارے حق میں بددعا کریں تو سال نہ گذرے کہ نصاریٰ میں سے ایک شخص بھی دکھائی نہ دے اور ان کی بددعا سے سب کچھ تباہ ہوجائے۔

یہ واقعہ مکمل طور پر حضرت فاطمہ زہرا کی اعلیٰ ترین عرفانی و معنوی شخصیت کی نشاندہی کرتا ہے مسیحیت کے برخلاف اسلامی عرفان و معنویت کا مقصد ''جوگ'' یا ''رہبانیت'' نہیں ہے بلکہ ایک جہاد مسلسل ہے اور انسان اجتماعی زندگی سے کنارہ کش نہیں ہوتا۔ اور اس مسئلہ کا عملی نمونہ جناب فاطمہ(س) نے پیش کیا ہے۔ جو تمام دنیا کی عورتوں کے لئے بہترین نمونہ ہیں۔

تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ جناب زہرا(س) نے بعض غزوات میں بھی شرکت کی ہے اور پیغمبر(صلعم) نے اجتماعی مسائل پر آپ سے مشورے بھی لئے ہیں اور ان جنگوں میں آپ کو ذمہ داریاں بھی تفویض کی ہیں۔

جناب زہرا(س) نے معاشرے کی اجتماعی اور فکری زندگی میں بھی شرکت کی ہے ،پیغمبر(صلعم) کی حدیثیں بھی بیان فرمائی ہیں ،خواتین کی ہدایت بھی ہے ، جنگوں میں حصہ بھی لیا ہے اور وقت ضرورت تلواروں اور تیروں کی بارش میں اپنے والد اور اپنے شوہر کا ساتھ بھی دیا ہے ، پیاسوں کو پانی پلایا ہے ،زخمیوں کی مرہم پٹی اور نگہداشت بھی کی ہے اور لشکر اسلام کی غیرت کو بھی للکارا ہے دوسرے اجتماعی مسائل میں بھی وہ اپنے والد ماجد کی معاون رہی ہیں جیسا کہ تاریخ سے ظاہر ہے کہ خواتین پیغمبر سے بیعت کررہی تھیں تو وہ جناب رسولؐ خدا کے ساتھ تھیں۔

بعد پیغمبرؐ بھی جناب فاطمہ زہرا(س) اسلامی معاشرہ کی خبرگیری کرتی رہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ جناب زہرا(س) وہ پہلی قوی تر ہستی تھیں جو فریاد رس اور ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے والی تھیں۔

مسجد نبوی میں آپ کی شعلہ بیان اور زلزلہ افگن تقریر آپ کی شجاعت ،شہامت ،الٰہی نگاہ اور سیاسی و اجتماعی دور بینی کو واضح کرتی ہے۔ اس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ عورت اسلامی معاشرہ میں اجتماعی ،سیاسی اور عورتوں کے بارے میں پیدا ہونے والے مسائل سے کنارہ کش نہیں ہے۔ اسلامی معاشرہ کی بخت سازی میں سہیم و شریک ہونے کے بعد بھی عورت کو یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ عورت ہے۔ اس صورت میں اسے اپنی عفت ،اپنا تقدس اور اپنے پردہ کو برقرار رکھنا چاہئے ۔ جناب سیدہ نے اپنی رفتار وگفتار سے مذکورہ بالا باتوں کو آشکارہ کیا ہے۔

انس بن مالک سے روایت ہے کہ پیغمبر خدا نے اپنے اصحاب سے پوچھا کہ ''کون سی چیز خواتین کے لئے سب سے اچھی ہے؟'' کوئی اس کا جواب نہ دے سکا۔ حضرت علیؑ فوراً جناب فاطمہ(س) کے پاس آئے اور ان

سے اس سوال کے متعلق دریافت کیا۔ جناب فاطمہ (س) نے کہا ''آپ نے کیوں نہ کہہ دیا کہ خواتین کے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ وہ مردوں کی جانب نظر نہ کریں اور مردوں کے لئے سب سے بہتر یہ ہے کہ وہ خواتین سے مرعوب نہ ہوں'' حضرت علیؑ جناب رسولؐ خدا (صلعم) کی خدمت میں تشریف لائے اور یہی جواب دہرا دیا۔

رسولؐ خدا (صلعم) نے فرمایا ''اے علیؑ تم کو اس جواب سے کس نے مطلع کیا؟'' حضرت علیؑ نے جواب دیا ''فاطمہ (س) نے'' اس پر پیغمبرؐ نے فرمایا ''سچ تو یہ ہے کہ فاطمہ (س) میرے ہی جسم کا ایک ٹکڑا ہے'' جناب زہرا (س) نے ثابت کر دیا کہ ایک مسلمان خاتون اسلامی معاشرے میں اپنی نسوانیت، عفت اور خودداری کے تحفظ کے ساتھ اجتماعی زندگی میں بھی شرکت کی حقدار ہے۔

اسی طرح ایک مسلمان خاتون خاندان کی خدمات انجام دینا، نئی نسل کی پرورش و پرداخت کو اپنا فریضہ سمجھتی ہے چنانچہ جناب فاطمہ زہرا (س) عرفانی اور روحانی مقامات پر آیت تطہیر کی تفسیر ہیں، دوسری طرف اجتماعی اور سیاسی زندگی میں بھی دخیل ہیں، خاندانی اور گھریلو ماحول میں ایک وفا شعار شریک حیات، ایک دختر وفادار اور ایک مادر مہربان بھی ہیں۔ جناب فاطمہ زہرا (س) اپنے والد گرامی کے لئے ایک مثالی اولاد ہیں، وہ صرف اولاد ہی نہیں بلکہ اپنے باپ کی پرستار، مشیر، رفیق اور معین بھی ہیں۔ تکلیفوں میں ان کا ساتھ دیتی ہیں اور انہیں تسلی دیتی ہیں اسی وجہ سے انہیں ''ام ابیھا'' یعنی اپنے باپ کی ماں کہتے ہیں۔

جناب فاطمہ (س) شوہر کے لئے ایک مہربان شریک حیات، حضرت علیؑ کی مونس تنہائی ہیں جو اپنے شوہر کے ساتھ مسلسل دکھ درد جھیل رہی ہیں لیکن پیشانی پر شکن تک نہیں آتی۔

جناب زہرا (س) ایک ایسی ماں ہیں جن کی آغوش میں حسنؑ، حسینؑ اور زینب (س) جیسی اولاد پروان چڑھتی ہے۔ عادات و اخلاق بلکہ ہر لحاظ سے جناب زہرا (س) بلاتفریق زن و مرد ہر ایک کے لئے نمونہ ہیں۔

### اسلام میں جناب زہرا صلوات اللہ علیہا عورتوں کے لئے منارۂ عظمت

جناب فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا اسلام میں خواتین کے مرتبہ کی عظمت و رفعت کی مظہر ہیں۔ تاریخ عالم میں پہلی بار اسلام ہی نے خواتین کو مکمل انسانی شخصیت بخشی ہے۔ یہاں تک کہ یونان جیسے ترقی پسند نظام میں بھی خواتین کو ثانوی درجہ دیا جاتا ہے حتیٰ کہ ظہور اسلام تک خود عرب عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں پست تر گردانتے تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں عربوں میں ایک مثل رائج تھی۔ **''المرأة حیوان طویل الشعر وقصیر الفکر''** یعنی عورت ایک ایسا جانور ہے جس کی زلفیں طویل مگر عقل کوتاہ ہے۔ عربوں ہی پر منحصر نہیں ہے دو صدیوں قبل تک نام نہاد متمدن مغربی ممالک میں بھی خواتین انفرادی حق ملکیت سے محروم تھیں۔

لیکن اس کے مقابلہ میں اسلام نے خواتین کو ایک کامل انسانی شخصیت عطا کی اور 'صنف' کے بجائے 'تقویٰ' کو بزرگی و برتری اور عظمت کا معیار قرار دیا۔ چنانچہ پیغمبرؐ

اسلام نے اعلان فرمایا''المرأۃ الصالحۃ خیر من الف رجل غیر صالح ''یعنی ایک متقی عورت ایک ہزار غیر صالح مردوں سے بہتر ہے(جامع الاخبار)اور فرمایا''من اخلاق الانبیاء حب النساء'' قرآن صریحی طور پر اعلان کرتا ہے ''للرجال نصیب مما اکتسبو ا وللنساء نصیب مما اکتسبن '' (نساء ۳۲)وللرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون (نساء ۷) قرآن نے یہ دستور بھی عطا کیا عاشروھن بالمعروف اور پیغمبرؐ نے فرمایا'' ولا تضربوا النساء کم فمن ضربھن بغیر حق عصی اللہ و رسولہ'' یہ تمام آیات اور حدیثیں خواتین سے متعلق اس شخصیت اور احترام کو ظاہر کرتی ہے،جن کا اسلام قائل ہے،اسلام نے عورت کو مکمل انسانی حقوق دیے اس کی روحانی فکری اور اجتماعی ترقی اور عظمت کے لئے راہ ہموار کی۔

اسلام میں عورت کی عظمت ،بلندی ،ترقی اور ارتقاء کا جو نظریہ ہے وہ مغربی تمدن کے نظریہ ارتقا سے قطعاً مختلف ہے۔اسلام کو عورت کو اپنی نسوانیت اور عورت ہونے کی خصوصیت کے تحفظ کے ساتھ ترقی کرنا سکھا تا ہے۔جبکہ مغربی تمدن عورت کو اپنی نسوانیت اصل خصوصیت اور اپنے حقیقی جوہر سے دست بردار ہوکر ترقی کی راہوں پر گامزن ہونے کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ ترقی دینا ہے کہ عورت کو زمرۂ نسوانیت سے خارج کردینا ہے عورت کی ترقی نہیں ہے۔

مغربی تمدن یہ سمجھتا ہے کہ عورت کی ترقی ناممکن ہے تاوقتیکہ وہ شکل وصورت کے اعتبار سے مرد نہ بن جائے ۔در اصل عورت کے لئے یہ بہت بڑی ذلت ہے کہ وہ حقوق نسواں کے تحفظ کی خاطر مردانہ صورت اختیار کرے اس کے برعکس اسلام چاہتا ہے کہ عورت اپنی اصل صورت اور خصوصیت سمیت اپنے حقوق کا تحفظ کرے کیوں کہ عورت کی اصل شخصیت بجائے خود ایک عظیم اہمیت کی حامل ہے اور اس کے اپنے فرائض ومقاصد مرد کے فرائض ومقاصد سے کسی طرح بھی کم قدر وقیمت کے حامل نہیں ہیں۔عورت کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کے اغراض ومقاصد اور فرائض میں ایک بڑا فریضہ آنے والے معاشرے کے لئے افزائش وتربیت نسل ہے اور ایک عورت کے لئے یہ قطعی نامناسب ہے کہ وہ 'انسانی سازی' جیسے عظیم فرض کو چھوڑ کر 'مشین سازی' جیسے ادنیٰ مقصد کے اپنانے کو اپنی معراج سمجھے جیسا کہ مغربی تمدن کا شعار ہے۔اسلام مساوی حقوق کا قائل ہے،'مشابہ حقوق' کا نہیں۔جبکہ مغرب میں مساوی حقوق کا مطلب ہے 'مشابہ حقوق' کا قائم رکھنا اور عورت سے اس کی برتر اور عظیم نسوانی شخصیت چھین کر اسے مردانہ وضع دینا ۔ اگر کوئی تہذیب ،گروہ یا فرد کہتا ہے کہ عورت کو چاہیے کہ وہ پہلے مردانہ وضع وقطع اختیار کرے اس کے بعد احترام کے قابل ہوگی تو ایسی تہذیب ،گروہ یا فرد صرف مردوں کے احترام کا قائل ہے اس نے درحقیقت عورت کی توہین کی ہے۔

☆ایمان اور حیا کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔اگر ان میں سے ایک چلا جائے تو دوسرا باقی نہ رہ سکے گا۔(جناب فاطمہؑ)

☆وہ عورت جو اپنے شوہر کو اذیت دے خداوند عالم اس کے نیک کاموں کو بھی قبول نہ کرے گا۔(جناب فاطمہؑ)

# اکلوتی اُم ابیھا

## (اپنے باپ کی ماں)

فاضل نبیل چودھری سبط محمد نقوی صاحب

جناب معصومۂ مظلومہ فاطمہ زہرا علیہا الصلوٰۃ والسلام کے نو اسمائے گرامی روایات میں آئے ہیں۔ فاطمہ، صدیقہ، مبارکہ، طاہرہ، زکیہ، راضیہ، مرضیہ، محدثہ اور زہراؑ۔ حضرت کی یاد کبھی آپ کی کنیت 'ام النبی' اور 'ام ابیھا' سے بھی کی جاتی ہے ان کے علاوہ آپ کی کنیتیں ام الحسنین، ام السبطین بھی وارد ہوئی ہیں۔ سب سے زیادہ شہرت ام الائمہ کو ہے۔

مگر ان کنیتوں میں ام ابیھا کا ذکر ہندوستانی مصنفوں نے بہت کم کیا ہے۔ ایک فاضل جلیل کے خداوند رحیم درجات عالی کرے انہیں تو اس کے درست ہونے ہی میں شک ہے۔ مرحوم نے اس کی قرأت 'ام ابنیھا' کی ہے یعنی حسنؑ و حسینؑ کی ماں۔

افسوس کہ مرحوم نے اپنے بیکراں علم و فضل کے باوجود یہاں سہل انگاری سے کام لیا۔ سب سے پہلی بات یہ کہ دو بیٹوں کی ماں ہونا کون سا شرف ہے۔ بہت سی خواتین دو سے زیادہ بیٹوں کی ماں ہوتی ہیں۔ یہ جناب خاتون جناں کے لئے تو کوئی خصوصی شرف کی بات نہیں۔ دوسرے یہ کہ ابنیھا کا ترجمہ حسنؑ و حسینؑ کی ماں مبنی بہ تکلف ہے آپ کی تمام کنیتوں میں واضح قرینہ موجود ہے۔ ابنیھا میں کوئی قرینہ موجود نہیں ہے کہ اس سے حضرات حسنین ہی مراد لئے جائیں۔

پھر یہ بھی کہ جو قیاس مصنف مغفور نے فرمایا ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ ام ابنیھا حضرات حسنینؑ کی ولادت کے بعد جناب معصومہؑ کی کنیت قرار پائی۔ افسوس کہ مرحوم نے اس تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی کہ کیا حسنینؑ کی ولادت یا امیر المومنینؑ کے ساتھ مناکحت سے قبل سرور کائنات نے بیٹی کو ام ابیھا کہہ کر خطاب نہیں فرمایا؟ مختصراً یہ راقم ہیچمدان مصنف علام کے قیاس کو مع الفارق سمجھتا ہے۔

قیامت بالائے قیامت یہ کہ مرحوم نے اس پر بھی توجہ نہیں فرمائی کہ محض ام ابیھا نہیں آیا ہے جسے قیاسی طور پر ام ابنیھا پڑھا جائے اور کھینچ تان کر اس کا ترجمہ حسنؑ اور حسینؑ کی ماں کیا جائے روایتوں میں ام النبی بھی حضرت کی کنیت وارد ہوئی ہے۔ معلوم نہیں اگر یہ مسئلہ مصنف مرحوم کے محضر مبارک میں پیش کیا جاتا تو اس کی قرأت کیا بتاتے۔

دراصل اگر تامل و تدبر کو راہ دی جائے تو یہ سمجھنے میں دقت نہیں ہو گی کہ اس کنیت کی وہی حیثیت ہے جو ''انا من الحسین'' کی ہے۔ جو تقریر انا من الحسین کی صحت کے اثبات میں کی جائے گی وہ سب 'ام النبی' اور 'ام ابیھا' کے اثبات میں کام آئے گی۔ مگر ہم اس کی دلچسپ بحث بعد میں پیش کریں گے پہلے یہاں استاد لوفیق ابو علم کی کتاب فاطمۃ الزہراؑ کے فارسی ترجمے نوشتۂ آقائے علی اکبر صادقی سے ایک اقتباس کا ترجمہ حاضر کرتے ہیں۔ براہ کرم اسے

پیشِ نظر رکھیں کہ ماتن محترم ایک مصری عالم اہلسنت ہیں۔

استاد فاضل حسینی لکھتے ہیں:

فاطمہؑ ولادت کے لحاظ سے نہیں بلکہ رسالت کی نظر سے رسولؐ خدا کی ماں شمار ہوتی ہیں اور شاید یہ خطاب اس وجہ سے تھا کہ پیغمبرؐ خدا جانتے تھے کہ تقدیر الٰہی ان کی ذریت کو صرف جناب زہراؑ کے دامان پاک سے پیدا کرے گی۔ فاطمہؑ درحقیقت ایک موج کی حیثیت رکھتی تھیں کہ جس نے رسولؐ خدا کے نور کو طول طویل زمانے تک پہنچایا اور بشریت کو اس نور فیاض سے روشن و نورانی بنائے رکھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ ان کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں کبھی کبھی ان کو 'ام ابیھا' کہہ کر بلاتے تھے۔

تاریخ نے بہ تکرار بیان کیا کہ پیغمبرؐ خدا، فاطمہؑ کو امِّ ابیھا کہہ کر مخاطب فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے ساتھ ماں جیسا سلوک کرتے تھے۔ آپ کے ہاتھ کا بوسہ لیتے تھے جب کبھی سفر سے مدینہ واپس تشریف لاتے تو پہلے انہیں دیکھنے جاتے اور یہ اس جہت سے تھا کہ رسولؐ ایسے یتیم تھے کہ جو اپنی ماں آمنہ بنت وہب سے چھٹپنے میں ہی محروم ہو گئے تھے اور اس سبب سے بھی اپنے روحانی خلاء کو فاطمہ بنت اسد حضرت علی علیہ السلام کی مادر گرامی کی محبت سے پر کرتے تھے اور انہیں ماں کہہ کر خطاب فرماتے تھے۔ اور جب ان خاتونِ معظّمہ کا دنیا سے انتقال ہوا، حضرتؐ کے قلب مہر پاش پر عظیم صدمے نے پنجہ گڑا دیا۔ لوگوں نے سنا کہ فرماتے تھے ''میں نے اپنی ماں کو کھو دیا۔'' خداوند متعال نے فاطمہؑ کو مرحمت فرمایا تا کہ فاطمہ بنت اسد کی یاد دلاتی رہیں اور ان کے وجود سے حضرت کے دل کو تسلی ملتی رہے۔ یہ بات تھی کہ فاطمہ کو ام ابیھا کہتے تھے۔ بغیر تردید، پیغمبر فوق البشر کھیل کھلواڑ میں کسی کو کسی لقب سے افتخار نہیں بخشتے تھے۔ اور نہ ہی اپنی پسند وخواہش سے کسی کے لئے کوئی کنیت تجویز فرماتے تھے کیونکہ حضور ہر چیز کو موافق مصلحت اپنی وضع شائستہ سے رکھتے تھے اور اس کام میں بھی ایک حکمت پنہاں تھی۔ اور حضرت جیسے کسی شخص کے لئے جو ایک عمود دین کے مانند آسمانوں و کہکشاؤں سے بھی بلند و بالا ہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ فاطمہؑ ان کی بیٹی شمار ہوتی ہیں یا ماں جیسے کہ شرف وفضیلت کے حامل درخت کے لئے جڑ و شاخیں ایک ہیں کہ اس کے سب اجزاء تابندہ اور نورافشاں ہیں اور کسی دوسرے کو اس کے ساتھ ہمسری اور ہم بستگی کا شرف نہیں ہے۔

اہلبیت اطہار کے شہرہ آفاق اردو سوانح نگار خان بہادر مولوی سید اولاد حیدر فوق بلگرامی مغفور نے بھی جناب معصومہ مظلومہؑ کی اس کنیت ام ابیھا کی طرف اعتنا نہیں فرمائی ہے۔ مگر اپنی بیش قیمت تصنیف ''سیرت فاطمۃ الزہرا'' میں علامہ شبلی نعمانی کے یہاں سے دو واقعات نقل کئے ہیں۔ ہم جناب فوق صاحب کی متعلقہ عبارت آپ کے ملاحظے میں پیش کرتے ہیں۔

''......ہم سیرۃ النبویہ کے اسناد سے اوپر لکھ آئے ہیں کہ حضرت خدیجہؑ اور جناب ابیطالب کے ایک بارگی اٹھ جانے سے مشرکین قریش کی موذی اور خونخوار جماعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایذا دہی اور ظلم رسانی میں اور شیر ہوگئی۔ علامہ نعمانی اسی زمانے کا ایک واقعہ لکھتے ہیں:

**بچپن میں رسولؐ کی خدمت اور رفاقت:-** آپ ایک دفعہ راہ میں جا رہے تھے۔ ایک شقی نے آ کر فرقِ مبارک پر خاک ڈال دی۔ اسی حالت میں آپ گھر تشریف لائے۔ آپ کی صاحبزادی نے دیکھا تو پانی لے کر آئیں۔ آپ کو سر دھوتی جاتی تھیں اور روتی جاتی تھیں۔ آپ نے فرمایا جان پدر! رو نہیں خدا تیرے باپ کو بچائے گا۔ (ص ۱۸۲)

پھر آگے چل کر اس سے بڑھ کر ظلم وستم اور آزار دہی کا ایک دوسرا واقعہ یوں قلم بند فرماتے ہیں:

''ایک دفعہ آپ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ رؤسائے قریش بھی موجود تھے۔ ابوجہل نے کہا کہ کاش اس وقت کوئی جاتا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھا لاتا کہ محمد سجدے میں جاتے تو ان کی گردن پر ڈال دیتا۔ عقبہ نے کہا کہ یہ خدمت میں انجام دیتا ہوں۔ چنانچہ اوجھ لا کر آپ کی گردن پر ڈال دی۔ قریش مارے ہنسی کے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ حضرت فاطمہؑ کو خبر لگی۔ اگرچہ اس وقت صرف پانچ چھ برس کی تھیں لیکن جوش محبت سے دوڑی ہوئی آئیں۔ اوجھ ہٹا کر عقبہ کو برا بھلا کہا اور بددعائیں دیں۔''

(ص ۱۸۶)

تاریخ مدینہ میں امام سمہودی لکھتے ہیں کہ آپ نے اس وقت جن جن کافروں کے لئے بددعا کی وہ سب کے سب غزوۂ احد میں مارے گئے۔ اور واصل جہنم ہوئے۔ مندرجہ بالا واقعات سے جناب سیدہؑ کو اپنے پدر عالی مقدار کے ساتھ اس چھوٹی سی عمر ہی سے جو روحانی تعلقات اور تکلیف و ایذا کے خاص وقتوں میں جیسے دردمندانہ جذبات کے خیالات وابستہ تھے وہ پورے طور پر واضح ہو گئے اور پھر ایسے کہ کسی آئندہ توضیح وتصریح کی حاجت باقی نہ رہی۔''

حیرت ہے کہ مصنف مرحوم کو یہ محض ''دردمندانہ جذبات'' سمجھ میں آئے۔ حدیث ''... انا من الحسین'' کی طرف ان کی نظر نکتہ بیں بھی نہ گئی۔ اگرچہ یہ روایت ترمذی میں نقل ہوئی ہے جو صحاح ستہ میں ہے۔ اگر حدیث مبارکہ کے اس ٹکڑے پر نظر ہوتی تو یقیناً اس طرز عمل میں ممتا کی خوشبو محسوس فرماتے۔ لیکن اس سے قبل کہ ہم اس کی ممکنہ توجیہات کی طرف متوجہ ہوں۔ پہلے جناب معصومہؑ اور تعظیم رسول کی طرف ایک نظر ڈال لیں۔ یہ پہلو جناب معصومہ مظلومہؑ کی فضیلت کا بہت نمایاں باب ہے۔ ہمارے ذاکرین عظام عظم اللہ والمومنین بوجودہم اس کو خاص طور سے بیان کرتے ہیں۔ حضورؐ سراپا نور اور جناب سیدہ مظلومہؑ کے سوانح نگار بھی اسے حضورؐ و معصومہؑ کے احوال میں زور دے کر بیان کرتے ہیں۔ لیکن آپ یہاں حضرت عائشہ سے منقول ایک روایت ملاحظہ فرمالیں، استاذ ابوعلم ناقل ہیں:

''عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کہتی ہیں ـــــ بات چیت میں فاطمہؑ سے زیادہ میں نے کسی اور کو رسولؐ خدا سے مشابہ نہیں دیکھا۔ جب بھی وہ اپنے والد کے حضور میں آتیں پیغمبر ان کے احترام میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوتے اور ان کے ہاتھ چومتے اور انہیں خوش آمدید کہتے اور اپنی مخصوص نشست پر بٹھاتے......''

اس غیر معمولی اور انوکھی تعظیم کے سلسلے میں حضرت الاستاذ علامہ علی نقی النقوی (سید العلماء) اعلی اللہ

مقامہ نے بڑی نکتہ آفریں بحث کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''...... بیٹی ہونے کا تقاضہ ہی نہیں کہ باپ تعظیم کو کھڑا ہو...... اصول یہ ہے کہ جو عمل رسول ہے وہ جزو سنت ہے جو تقریر رسولؐ ہے وہ بھی جز و سنت ہے۔ تقریر یعنی کوئی دوسرا رسولؐ کے سامنے کوئی عمل کرے اور رسولؐ اس کو منع نہ کریں۔ یہ بھی اصول ہے کہ سنت رسولؐ کی پیروی یا سنت واجب ہوگی ...... یہ ایک عمل رسولؐ ہے جو بالاتفاق موجود ہے ......مشترک اسلامی نقطۂ نظر سے اور خود ہمارے معتقدات کی روشنی میں کسی نے بھی جو سنت رسولؐ کی پیروی کا دعوے دار تھا کبھی اس سنت رسولؐ پر عمل نہیں کیا......''

اس کے بعد جناب مرحوم نے اس کی بہت لطیف توجیہ فرمائی لیکن ہم اسے یہاں پیش نہیں کر رہے ہیں۔ مشتاق مومنین تلاشیں اور پڑھیں۔ ہم تو حضرت الاستاذ کے افادے سے کام لینا چاہتے ہیں جو آپ نے ''...... انامن الحسین کے مبحث میں فرمایا ہے۔ کیونکہ جیسا ہم پہلے عرض کر چکے ہیں۔ جب تک انا من الحسین کی معنویت ذہن نشین نہیں ہوگی۔ 'ام ابیھا' یا 'ام النبی' کی معقولیت واضح نہیں ہوسکتی۔ قبل اس کے کہ ہم اقتباس نقل کریں، ایک فقرہ یہ عرض کرتے ہیں کہ اگر نواسے سے نانا کی بقا ہوسکتی ہے تو بیٹی سے باپ کی کیوں نہیں!

اب آپ جناب مرحوم کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:-

''...... آپ نے فرمایا حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ ان دو جملوں میں آخر ربط کیا ہے۔ پہلے میں کچھ اور ہو اور دوسرے میں کچھ اور ہو تو وہ ایسے جیسے شعر دو لخت ہوتا ہے۔ ویسے بے جوڑ فقرے ہو جائیں گے۔ لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ دونوں میں کوئی مناسبت ہو۔ اس وقت جو پہلو عرض کرنا ہے وہ یہ کہ ایک ہوتا ہے شے کا وجود اور ایک ہوتی ہے شے کی بقا۔ پہلا جملہ جو ہے کہ 'حسینؑ مجھ سے ہے' وہ وجود کے لحاظ سے ہے دوسرا جملہ جو ہے وہ بقا کے لحاظ سے ہے یعنی حسینؑ کا وجود میرے وجود سے ہے اور میری بقا حسینؑ کی وجہ سے ہے۔ اور اب میں اردو کے ایک جملے میں ترجمہ کرسکتا ہوں کہ ''حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں'' یعنی اگر میں نہ ہوتا تو حسینؑ نہ ہوتا اور اگر حسینؑ نہ ہوتا تو میں نہ رہتا۔ جس وقت سے حسینؑ پیدا ہوئے ۳ رشعبان ۳ھ سے لے کر ۱۰ رمحرم ۶۱ھ تک حسینؑ رسولؐ سے اور ۱۰ رمحرم ۶۱ھ سے لے کر قیامت تک رسولؐ حسینؑ سے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایک انسان کی بقا اس کے نام اور کام کی بقا سے ہے۔ ۶۰ھ میں رسولؐ کا نام بھی خطرہ میں تھا اور کام بھی خطرہ میں تھا۔ تو اب جس نے اپنی قربانی دے کر رسولؐ کے نام اور کام کو باقی رکھا وہ رسولؐ کی بقا کا سبب ہے یہی تو اتنا بڑا مقصد ہے جس کے لئے اتنی قربانیاں پیش کی گئیں۔''

یہ کون کہہ سکتا ہے کہ رسولؐ کے نام اور کام کی بقا میں جناب معصومہ مظلومہؑ نے براہ راست ؑ بہ شرکت شوہر اور بذریعہ اولا دو احفادکم یا کمتر درجے کی قربانیاں دی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناطق بحکم خدا، ممدوح ما ینطق عن الھویٰ نے اپنی بیٹی کو ام ابیھا کہا۔

اس ناچیز تحریر کو کتابت کے کے حوالے کر دیا گیا تھا تب حضرت الاستاذ علامہ علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ کی

کتاب 'رہنمایانِ اسلام' کے مراجعے کی ضرورت پیش آئی۔
جناب مرحوم نے اس ذیل میں جو افادہ فرمایا ہے وہ یہ ہے:
''آپ حضرت خدیجہ بن خویلد کے بطن سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرد فرید بیٹی تھیں جن کی نسل پاک سے باپ کے نام اور کام کی بقا رہی اور شاید اسی مناسبت سے آپ کی وہ کنیت ہوئی جس کے معنی ہوتے ہیں اپنی باپ کی ماں یعنی وہ خاتون جو اپنے باپ کی زندگی کو پروان چڑھانے کا سبب ہوئی۔''

تحقیقی بات تو یہی ہے کہ آپ اکلوتی ''ام ابیھا'' ہیں جنہوں نے نہ صرف یہ نام پایا بلکہ اپنے باپ سے ماں والا اعزاز بھی پایا۔ اس شرف کے غصب کی کوشش کا ہمیں علم نہیں اسے بھی معصومہؑ کے ساتھ ایک رحمت ربانی سمجھنا چاہیئے کہ ایک ایسے نام کا اہتمام کر دیا جو تاریخ میں اکلوتا ہے۔

❁❁❁

---

# مدح مختار جنت

جناب خادم شبیر نصیر آبادی

اس بزم تک شعور کی طاہر شراب لا
ساقی بس ایک ساغر عصمت مآب لا

تاریخ دختران جہاں میں اگر ملے
کوئی نظیر بنت رسالت مآب لا

یوں تو بہت ملیں گے نبیؐ کے مخاطبے
اے دین مثل ام ابیھا خطاب لا

خیاط جو بنا دے فرشتے کو دہر میں
ایسی کوئی زبان صداقت مآب لا

ان کے سوا تھا جزو حیات نبیؐ کوئی
اس طرح کی حدیث رسالت مآب لا

اٹھتا تھا کون بیٹی کی تعظیم کے لئے
بس میرے اس سوال کا کوئی جواب لا

گر چاہتا ہے حشر میں مٹی نہ ہو خراب
ہم بو ترابیوں کی زمیں سے تراب لا

قرآں ہو جس کی صورت و سیرت کا آئینہ
ہو جس کی ذات حامل ام الکتاب لا

دنیا میں جو ہو طاعت خالق کی آبرو
سجدہ وہ سیدہ کی طرح کامیاب لا

مثل علیؑ جو ہمسر بنت نبیؐ بنے
خالق سی دوسری نگہہ انتخاب لا

ان کا تو حشر تک نہ ملے گا کہیں جواب
ان کی جو ہے کنیز اسی کا جواب لا

جس میں بیاں فضیلت بنت نبیؐ نہ ہو
ایسی جو آسماں پہ ہو کوئی کتاب لا

عصمت کا تحفہ باغ محمدؐ سے مانگ کر
''عقد بتول ہو تو ثنا کے گلاب لا''

خادمؔ عجیب حکم تھا لا کی ردیف میں
لکھ کر ثنائے بنت رسالت مآب لا

# معراج انسانیت

## سیرت امام محمد باقر، امام محمد تقی اور امام علی نقی علیہم السلام کی روشنی میں

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی النقوی طاب ثراہ

### امام محمد باقر علیہ السلام

**ولادت:-** یکم رجب ۵۷ھ

**وفات:-** ۷ رذی الحجہ ۱۱۴ھ

آپ کا دور بھی مثل اپنے پدر بزرگوار کے وہی عبوری حیثیت رکھتا تھا جس میں شہادت حضرت امام حسینؑ سے پیدا شدہ اثرات کی بنا پر بنی امیہ کی سلطنت کو ہچکولے پہنچتے رہتے تھے مگر تقریباً ایک صدی کی سلطنت کا استحکام ان کو سنبھال لیتا تھا بلکہ فتوحات کے اعتبار سے سلطنت کے دائرہ کو عالم اسلام میں وسیع تر کرتا جاتا تھا۔

حضرت امام محمد باقرؑ خود واقعہ کربلا میں موجود تھے اور گو طفولیت کا دور تھا یعنی تین چار برس کے درمیان عمر تھی مگر اس واقعہ کے اثرات اتنے شدید تھے کہ عام بشری حیثیت سے بھی کوئی بچہ ان تاثرات سے علیحدہ نہیں رہ سکتا تھا۔ چہ جائیکہ یہ نفوس جو مبداء فیض سے غیر معمولی ادراک لے کر آئے تھے وہ اس کم عمری میں جناب سکینہؑ کے ساتھ ساتھ یقیناً قید و بند کی صعوبت میں بھی شریک تھے اس صورت میں انسانی و دینی جذبات کے ماتحت آپ کو بنی امیہ کے خلاف جتنی بھی برہمی ہوتی ظاہر ہے چنانچہ آپ کے بھائی زید بن علی بن الحسینؑ نے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ۔ بنی امیہ کے مقابلے میں تلوار اٹھائی۔ اسی طرح سادات حسنیؑ میں سے متعدد حضرات وقتاً فوقتاً بنی امیہ کے خلاف کھڑے ہوتے رہے حالانکہ واقعہ کربلا سے براہ راست جتنا تعلق حضرت امام محمد باقرؑ کو رہا تھا اتنا جناب زید کو بھی نہ تھا چہ جائیکہ حسنی سادات جو نسباً دوسری شاخ میں تھے۔ مگر یہ آپ کا وہی جذبات سے بلند ہونا تھا کہ آپ کی طرف سے کبھی کوئی اس قسم کی کوشش نہیں ہوئی اور آپ کبھی کسی ایسی تحریک سے وابستہ نہیں ہوئے بلکہ ضرورت پڑنے پر اپنے دور کی حکومت کو مفادِ اسلامی کے تحفظ کے لیے اسی طرح مشورے دیئے جس طرح آپ کے جدامجد حضرت علی ابن ابیطالبؑ اپنے دور کی حکومتوں کو دیتے رہے تھے۔ چنانچہ رومی سکّوں کے بجائے اسلامی سکہ آپ ہی کے مشورہ سے رائج ہوا جس کی وجہ سے مسلمان اپنے معاشیات میں دوسروں کے دست نگر نہیں رہے۔

باوجودیکہ زمانہ آپ کو والد بزرگوار حضرت امام زین العابدینؑ کے زمانہ سے بہتر ملا۔ یعنی اس وقت مسلمانوں کا خوف و دہشت اہل بیتؑ کے ساتھ وابستگی میں کچھ کم ہو گیا تھا اور ان میں علوم اہل بیتؑ سے گرویدگی بڑے ذوق وشوق کے ساتھ پیدا ہو گئی تھی کوئی دوسرا ہوتا تو اس علمی مرجعیت کو

سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنالیتا مگر ایسا نہیں ہوا اور حضرت امام محمد باقرؑ مسلمانوں کے درمیان ایک طرح کی مرجعیت عام حاصل ہونے کے باوجود سیاست سے کنارہ کشی میں اپنے والد بزرگوار کے قدم بہ قدم ہی رہے۔

بے شک زمانہ کی سازگاری سے آپ نے واقعۂ کربلا کے تذکروں کی اشاعت میں فائدہ اٹھایا۔ اب واقعہ کربلا پر اشعار نظم کئے جانے لگے اور پڑھے جانے لگے امام زین العابدینؑ کا گریہ آپ کی ذات تک محدود تھا اور اب دوسروں کو ترغیب وتحریص بھی کی جانے لگی۔ اس کے علاوہ نشر علوم آل محمدؐ کے فریضہ کو کھل کر انجام دیا گیا۔ اور دنیا کے دل پر علمی جلالت کا سکہ بٹھا دیا گیا۔ یہاں تک کہ مخالفین بھی آپ کو ''باقر العلوم'' ماننے پر مجبور ہوئے جس کا مفہوم ہی ہے 'علوم کے اسرار ورموز کو ظاہر کرنے والے' اس طرح ثابت کر دیا کہ آپ اپنے کردار میں انہی علی ابن ابیطالبؑ کے صحیح جانشین ہیں جنہوں نے پچیس برس تک سلطنت اسلامیہ کے بارے میں اپنے حق کے ہاتھ سے جانے پر صبر کرتے ہوئے صرف علوم ومعارف اسلامیہ کے تحفظ کا کام انجام دیا۔ وہی ورثہ تھا جو سینہ بہ سینہ حضرت محمد باقرؑ تک پہنچا تھا۔ نہ امتداد زمانہ نے اس میں کہنگی پیدا کی تھی اور نہ اس رنگ کو مدھم بنایا تھا۔ نہ تسلسل مظالم کے اثر سے انتقامی جذبات کے غلبہ نے ان کو بنیادی مقاصد حیات سے غافل کیا۔

## امام محمد تقی علیہ السلام

**ولادت:-۱۰/رجب ۱۹۵ھ**

**وفات:-۲۹/ذیقعدہ ۲۲۰ھ**

آپ پانچویں برس میں تھے جب آپ کے والد بزرگوار امام رضاؑ سلطنت عباسیہ کے ولی عہد ہو گئے اس کے معنی یہ ہیں کہ سن تمیز پر پہنچنے کے بعد ہی آپ نے آنکھ کھول کر وہ ماحول دیکھا جس میں اگر چاہا جاتا تو عیش وآرام میں کوئی کمی نہ رہتی۔ مال ودولت قدموں سے لگا ہوا تھا اور تزک و احتشام آنکھوں کے سامنے تھا پھر باپ سے جدائی بھی تھی کیونکہ امام رضاؑ خراسان میں تھے اور متعلقین تمام مدینہ منورہ میں تھے۔ اور پھر آپ کو آٹھواں ہی برس تھا کہ امام رضاؑ نے دنیا ہی سے مفارقت فرمائی۔

یہ وہ منزل ہے کہ جہاں ہمارے تاریخی کارخانۂ تحلیل وتوجیہ کی تمام دوربینیں بیکار ہوجاتی ہیں۔ کسی دنیوی مکتب اور درسگاہ میں تو نہ ان کے آباء واجداد کبھی گئے نہ یہ جاتے نظر آتے ہیں۔ ہاں ایک معصوم کے لیے معصوم بزرگوں کی تعلیم وتربیت ناقابل انکار ہے مگر یہاں معصوم باپ سے چار پانچ برس کی عمر میں جدائی ہوگئی۔ ایک توارثِ صفات رہ جاتا ہے مگر ہر ایک جانتا ہے کہ اس سے صلاحیت کا حصول ہوتا ہے۔ فعلیت کے لیے پھر اسباب ظاہری کی ضرورت ہے۔ مگر یہ تاریخی واقعہ ہے کہ امام محمد تقیؑ نے بچپن کی جتنی منزلیں اس کے بعد طے کیں وہ ابھی شباب کی سرحد تک بھی نہ تھیں کہ آپ کی سیرتِ بلند کی مثالیں اور علمی کمال کی تجلیاں دنیا کی آنکھوں کی سامنے آگئیں۔ یہاں تک کہ امام رضاؑ کی وفات کے بعد ہی شاہی دربار میں اکابر علمائے وقت سے مباحثہ ہوا تو سب کو آپ کی عظمت کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔

اب یہ واقعہ کوئی صرف اعتقادی چیز بھی نہیں ہے بلکہ مسلم الثبوت طور پر تاریخ کا ایک جزء ہے یہاں تک کہ اس مناظرہ کے بعد اسی محفل میں مامون نے اپنی لڑکی ام الفضل کوآپ کے حبالۂ عقد میں دیا۔

یہ سیاست مملکت کا ایک نئی قسم کا سنہرا جال تھا جس میں امام محمد تقیؑ کی کمسنی کو دیکھتے ہوئے خلیفۂ وقت کو کامیابی کی پوری توقع ہو سکتی تھی۔

''بنی امیہ کے بادشاہوں کو آلِ رسولؐ کی ذات سے اتنا اختلاف نہ تھا جتنا ان کے صفات سے۔ وہ ہمیشہ اس کے در پے رہتے تھے کہ بلندئی اخلاق اور معراج انسانیت کا وہ مرکز جو مدینہ میں قائم ہے اور جو سلطنت کے مادی اقتدار کے مقابلہ میں ایک مثالی روحانیت کا مرکز بنا ہوا ہے یہ کسی طرح ٹوٹ جائے اسی کے لیے وہ گھبرا گھبرا کر مختلف تدبیریں کرتے تھے۔ امام حسینؑ سے بیعت طلب کرنا اسی کی ایک شکل تھی اور پھر امام رضاؑ کو ولی عہد بنانا اسی کا دوسرا طریقہ۔

فقط ظاہری شکل میں ایک کا انداز معاندانہ اور دوسرے کا طریقہ ارادت مندی کے روپ میں تھا مگر اصل حقیقت دونوں باتوں کی ایک تھی۔ جس طرح امام حسینؑ نے بیعت نہ کی تو وہ شہید کر ڈالے گئے اسی طرح امام رضاؑ ولی عہد ہونے کے باوجود حکومت کے مادی مقاصد کے ساتھ نہ چل سکے تو آپ کی شمع حیات کو زہر کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا گیا۔''

اب مامون کے نقطۂ نظر سے یہ موقع انتہائی قیمتی تھا کہ امام رضاؑ کا جانشین آٹھ نو برس کا ایک بچہ ہے جو تین چار برس پہلے ہی باپ سے چھڑا لیا جا چکا تھا حکومت وقت کی سیاسی سوجھ کہہ رہی تھی کہ اس بچے کو اپنے طریقہ پر لانا نہایت آسان ہے اور اس کے بعد وہ مرکز جو حکومت وقت کے خلاف ساکن اور خاموش مگر انتہائی خطرناک قائم ہے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔

مامون امام رضاؑ کی ولی عہدی کی مہم میں اپنی ناکامی کو مایوسی کا سبب تصور نہیں کرتا تھا اس لئے کہ امام رضاؑ کی زندگی ایک اصول پر قائم رہ چکی تھی اس میں تبدیلی نہیں ہوئی تو یہ ضروری نہیں کہ امام محمد تقیؑ آٹھ برس کے سن میں خاندان شہنشاہی کا جزء بنا لیے جائیں تو وہ بھی بالکل اپنے بزرگوں کے اصول زندگی پر برقرار رہیں۔

سوا ان لوگوں کے جو ان مخصوص افراد کے خداداد کمالات کو جانتے تھے اس وقت کا ہر شخص یقینا مامون کا ہم خیال ہوگا۔ مگر حضرت امام محمد تقیؑ نے اپنے کردار سے ثابت کر دیا کہ جو ہستیاں عام جذبات کی سطح سے بالاتر ہیں اور یہ بھی اسی قدرتی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں جن کے افراد ہمیشہ معراج انسانیت کی نشاندہی کرتے آئے ہیں آپ نے شادی کے بعد محل شاہی میں قیام سے انکار فرمایا اور بغداد میں جب تک قیام رہا آپ ایک علیحدہ مکان کرایہ پر لے کر اس میں قیام پذیر ہوئے اور پھر ایک سال کے بعد ہی مامون سے حجاز واپس جانے کی اجازت لے لی اور مع ام الفضل کے مدینہ تشریف لے گئے اور اس کے بعد حضرت کا کاشانہ گھر کی ملکہ کے دنیوی شاہزادی ہونے کے باوجود بیت الشرف امامت ہی رہا، قصر دنیا نہ بن سکا۔ ڈیوڑھی کا وہی

انداز رہا جو اس کے پہلے تھا۔ نہ پہرے دار اور نہ کوئی خاص روک ٹوک، نہ تزک واحتشام، نہ اوقات ملاقات کی حد بندی نہ ملاقاتیوں کے ساتھ برتاؤ میں کوئی فرق۔ زیادہ تر نشست مسجد نبوی میں رہتی تھی جہاں مسلمان حضرت کے وعظ و نصیحت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ راویان حدیث احادیث دریافت کرتے تھے، طلاب علم مسائل پوچھتے تھے اور علمی مشکلات کو حل کرتے تھے۔ چنانچہ شاہی سیاست کی شکست کا نتیجہ یہ تھا کہ آخر آپ کا بھی زہر سے اسی طرح خاتمہ کیا گیا جس طرح آپ کے بزرگوں کا اس سے پہلے کیا جاتا رہا تھا۔

## امام علی نقی علیہ السلام

**ولادت: ۵- رجب ۲۱۴ھ**

**وفات: ۳- رجب ۲۵۴ھ**

آپ کی زندگی میں بھی وہی خصوصیتیں موجود ہیں جو آپ کے آباؤ اجداد میں تھیں۔ آپ کو متوکل نے مدینہ سے بلوا کر سامرے میں نظر بند کیا اور متعدد اشخاص کی نگرانی آپ پر قائم کی۔ مگر آپ کے اخلاق حمیدہ نے ہر ایک کو متاثر کیا۔ آپ کی خاموش زندگی صحیح اسلامی سیرت کی عملی مثال تھی اور ہمیشہ اس مشن کو جو تبلیغ دین وشریعت کا تھا، حفاظت کرتے رہے۔

ایسے موقعوں پر جب جذباتی انسان یا تو مرعوب ہو کر دوسرے کا ہم رنگ ہوجائے یا مشتعل ہو کر مرنے مارنے پر تیار ہوجائے یہ ضبط نفس معراج انسانیت کا نمونہ تھا کہ نہ اپنے جادۂ عمل کو چھوڑا جاتا تھا اور نہ تصادم کی صورت پیدا کی جاتی تھی۔

متوکل کا دربار جہاں شراب کا دور چل رہا تھا۔ اس میں امامؑ کی طلبی اور جام شراب کا پیش کیا جانا اور آپ کے انکار پر یہ فرمائش کہ کچھ اشعار ہی سنایئے اور آپ کا اس موقع سے وعظ کے لیے گنجائش نکالنا اور بے اعتباری دنیا اور محاسبۂ نفس کی دعوت پر مشتمل وہ اشعار پڑھنا جنہوں نے اس محفل عیش کوشی کو مجلس وعظ میں تبدیل کر کے وہ اثر پیدا کیا کہ حاضرین زار وقطار رونے لگے اور بادشاہ بھی چیخیں مار مار کر گریہ کرنے لگا۔ یہ انہی حضرت زین العابدینؑ کے وارث کا کام ہوسکتا تھا جنہوں نے دربار ابن زیاد و یزید میں اظہار حقائق کے کسی موقع کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔

قید کے زمانہ میں آپ جہاں بھی رہے آپ کے مصلے کے سامنے ایک قبر کھدی ہوئی تیار رہتی تھی۔ یہ ظالم طاقت کو اس کے باطل مطالبۂ اطاعت کا ایک خاموش اور عملی جواب تھا یعنی زیادہ سے زیادہ تمہارے ہاتھ میں جو ہے وہ جان کا لے لینا مگر جو موت کے لیے اتنا تیار ہو وہ ظالم حکومت سے ڈر کر باطل کے سامنے سر کیوں خم کرنے لگا۔

پھر بھی مثل اپنے بزرگوں کے حکومت کے خلاف کسی سازش وغیرہ سے آپ کا دامن ایسا بری رہا کہ باوجود دارالسلطنت کے اندر مستقل قیام اور حکومت کے سخت ترین جاسوسی نظام کے آپ کے خلاف کوئی الزام کبھی عائد نہیں کیا جا سکا حالانکہ عباسی سلطنت اب کمزور ہو چکی تھی۔ اور وہ دم توڑنے کے قریب تھی مگر آل محمدؐ نے ان حکومتوں کو ہمیشہ اپنی موت مرنے کے لیے چھوڑا ان کے خلاف کبھی کسی اقدام کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی۔

❀❀❀

# ظلم کو روکنے کے لئے معجزہ کیوں نہیں......؟

حجۃ الاسلام عبد العظیم المہتدی البحرانی
ترجمہ: مولانا نثار احمد زین پوری صاحب

## معجزہ کیا ہے؟

اسلامی اصطلاح میں معجزہ یہ ہے کہ خدا، نبی یا ولی کے ذریعہ ایسا کام انجام دلا دیتا ہے کہ جس سے تمام لوگ عاجز رہتے ہیں۔ نبی اپنی نبوت کے اثبات کے اور ولی اپنی ولایت کی صداقت کے اثبات کے لئے معجزہ دکھاتا ہے۔

مثلاً حضرت موسیٰ

فرعون کے جادوگروں پر حملہ آور ہوا۔ اور جادوگر اپنے جادو میں مہارت کے باوجود اس معجزہ کا مقابلہ نہ کرسکے جو خدا کے ارادہ سے موسیٰ

دوسری مثال حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ ہے، جناب عیسیٰؑ پرندہ کی صورت بناتے اور اس میں پھونک دیتے تھے تو وہ اذن خدا سے پرندہ بن جاتا تھا۔

جناب عیسیٰؑ پیدائشی اندھوں اور مبروص کا علاج کر دیتے تھے اور اذن خدا سے مردوں کو زندہ کرتے تھے اس زمانہ کے لوگوں کو یہ بتا دیا کرتے تھے کہ وہ کیا کھاتے ہیں اور اپنے گھروں میں کیا ذخیرہ کرتے ہیں۔ (آل عمران۔۴۹)

تیسری مثال ہمارے نبی محمدؐ کے معجزات ہیں، جیسے شق القمر کا معجزہ۔ خدائے متعال کا ارشاد ہے:

**اقتربت الساعة وانشق القمر وان یروا اٰیة یعرضوا ویقولوا سحر مستمر۔** (قمر۱۔۲)

قیامت قریب آگئی اور چاند کے دو ٹکڑے ہوگئے یہ کوئی آیت دیکھتے ہیں تو اس سے منھ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ مسلسل جادو ہے۔

معراج اور آسمانی سفر والا معجزہ۔ ارشاد ہے:

**سبحان الذی اسریٰ بعبده لیلا من المسجد الحرام الیٰ المسجد الاقصیٰ الذی بر کنا حوله لنریه من اٰیتنا انه هو السمیع البصیر۔** (اسریٰ۔۱)

پاک ہے وہ ذات جو لے گئی راتوں رات اپنے بندہ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کہ جس کے اطراف کو ہم نے برکتوں سے نوازا ہے تاکہ ہم اپنے بندہ کو اپنی آیات دکھائیں کہ وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

یا درخت کا گویا ہونا جیسا کہ امیر المومنینؑ نے نہج البلاغہ میں فرمایا ہے! اور غار کے دروازہ پر مکڑی کا اس وقت جالا بنا دینا جب آپؐ مشرکین سے جان بچانے کے لئے غار میں داخل ہوئے۔

ابن عباس سے روایت ہے: ایک روز ابوسفیان رسولؐ کے پاس آیا اور کہنے لگا ''اے اللہ کے رسولؐ میں آپ سے ایک چیز کا سوال کرنا چاہتا ہوں۔''

آنحضرتؐ نے فرمایا: اگر تمہیں پسند ہو تو میں تمہارے سوال کرنے سے پہلے ہی اس سے خبردار کردوں!
اس نے کہا بتائیے۔

آپؐ نے فرمایا: تم مجھ سے یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ میری عمر کتنی ہوگی؟ اس نے کہا ہاں اللہ کے رسولؐ! آپ نے کہا: میں ۳۳ سال زندہ رہوں گا۔

اس نے کہا: میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ صادق ہیں۔
رسولؐ نے فرمایا: تم زبان سے یہ بات کہتے ہو دل سے نہیں۔

ابن عباس نے کہا: خدا کی قسم وہ منافق تھا، ہم ایک محفل میں تھے جس میں ابوسفیان بھی تھا لیکن وہ اندھا ہو گیا تھا، ہمارے درمیان علیؑ بھی موجود تھے، کہ موذن نے اذان شروع کی اس نے اشهد ان محمداً رسول اللہ کہا تو ابوسفیان نے کہا: یہاں کوئی بنی ہاشم میں سے تو نہیں ہے، کسی نے کہا ایک ہے: ابوسفیان نے کہا دیکھو! محمدؐ نے اپنا نام کس جگہ فٹ کیا ہے!

حضرت علیؑ نے فرمایا: خدا تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈا نہ رکھے یہ خدا نے رکھا ہے وہ فرماتا ہے: **ورفعنا لک ذکرک** اور ہم نے آپ کے ذکر کو بلند کیا۔

ابوسفیان نے کہا: خدا اس شخص کی آنکھوں کو ٹھنڈا نہ رکھے جس نے یہ کہا ''یہاں کوئی بنی ہاشم میں سے نہیں ہے۔'' (الخرائج ج ۱ ص ۶۱ بحارالانوار ج ۱۸ ص ۱۱۱)

علامہ مجلسی اپنی کتاب ''حیات القلوب'' میں کچھ معجزات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: رسولؐ کے جو معجزات ہم نے نقل کئے ہیں وہ درحقیقت سمندر سے ایک قطرہ ہیں اور آپؐ کے بے پناہ معجزات میں سے بہت ہی مختصر ہیں۔

کیونکہ آپؐ کے تمام اقوال و اخلاق معجزہ ہیں، خصوصاً آپؐ کا غیب کی خبر دینا معجزہ ہے اور آپؐ کا کلام ہمیشہ غیب کی خبروں پر مشتمل ہوتا تھا، یہاں تک کہ منافقین کہتے تھے کہ کوئی بات نہ کہو کیونکہ یہ دیوار، کنکر اور پتھر محمدؐ تک تمہاری بات پہونچا دیں گے۔ (بحارالانوار ج ۱۸ ص ۱۱۱)

قرآن کی آیات، رسولؐ اور آپ کے اہل بیتؑ کی روایات اور آپ کی سیرت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ معجزہ اس وقت دکھایا جاتا تھا جب کسی ایسی بنیادی چیز کو ثابت کرنا ہوتا تھا جس پر دیگر امور کی اساس ہوتی تھی۔

جیسے رسولؐ کی نبوت کا اثبات، اس کے لئے ایسا معجزہ ضروری ہے کہ جس سے مادہ میں خارق العادات فعل انجام دے سکے تا کہ لوگ اسے اللہ کا نبی اور خالق کی طرف سے مرسل سمجھیں، جب آپ کی نبوت ثابت ہو جائے گی اور لوگوں کو ان کی صداقت کا یقین ہو جائے گا تو وہ نبیؐ کے احکامات کی پابندی کریں گے اور جس سے وہ روکے گا یہ باز رہیں گے اور اسی قول کی روشنی میں زندگی گذار دیں گے۔ یعنی جب یہ ثابت ہو جائے گا یہ دعوائے نبوت میں سچے ہیں اور یہ اللہ کی طرف سے لوگوں کی طرف رسولؐ ہیں تو پھر ہر چیز کے لئے معجزہ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اب عمل کی ضرورت ہے یہاں تک کہ خود رسولؐ کو بھی عمل کرنا ہے۔

کیونکہ خدا نے انبیاءؑ اور رسل کو اس لئے نہیں بھیجا

کہ وہ ہر اصل وفرع میں اور چھوٹی بڑی چیز میں معجزہ کے جوہر دکھائیں کہ جو زندگی کی ڈگر اور اصل عمل کا بدل ہوجائے۔ ہم شروع ہی میں کہہ چکے ہیں کہ اس حیات میں اصل عمل اور کام ہے۔ انبیاءؑ اور رسل کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان میں سے ہر ایک معجزہ کے رموٹ کنڑول سے، گھر میں، تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے بیٹھے آرام و اطمینان کے ساتھ تمام چیزوں میں تصرف کرے!

خدا نے انہیں معجزہ کی صلاحیت صرف اس لئے دی ہے تا کہ وہ اپنے دعوائے نبوت کو ثابت کرسکیں پھر اثبات نبوت کے بعد خود رسول اور ان کی اتباع کرنے والوں کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس سنتِ حیات کے مطابق عمل کریں جو انسان کے لیے آسانی پیغام ہے۔ یہ ٹھوس حقیقت ہے جسے آپ تمام انبیاءؑ کی زندگی اور تمام اوصیاء کی سیرت میں ملاحظہ کرسکتے ہیں۔

**سیرت سے ہدایت:-** یہاں تک سنت حیات اور معجزہ کا مفہوم واضح ہوگیا یہ بھی آشکار ہوگیا کہ معجزہ کیوں اور کہاں دکھایا جاتا ہے۔

اب ہم رسولؐ خدا کی حیات طیبہ اور سیرت اہلبیتؑ پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں کہ وہ دین کو زندگی میں کس طرح شامل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک طرف تو مسلمانوں کے امور کی زمام سنبھالتے ہیں اور ان کی ہدایت کرتے ہیں۔ خود کام کرتے ہیں اور معیشت کے لئے جانفشانی کرتے ہیں۔ ایک زمانہ تک رسولؐ نے تجارت کی، کچھ عرصہ بھیڑ بکریاں چرائیں، کاشتکاری بھی کی، اور آپؐ کی ذریت میں سے بعض نے زراعت کے امور اور کاشتکاری کے سلسلہ میں اس لئے پسینہ بہایا تا کہ مسلمانوں کے افکار کو صحیح سمت دے سکیں اور انہیں اسلام کے مطابق عمل کرنے اور سعادت سے ہمکنار کرنے کی ہدایت کرسکیں۔

ایک راوی کہتا ہے گرمیوں کے زمانہ میں ظہر کے وقت امام محمد باقرؑ کو اپنے جد رسولؐ کے مدینہ میں اپنے کھیت میں کام کرتے دیکھا۔ بدن سے پسینہ بہہ رہا تھا، ان کی اس حالت پر مجھے افسوس ہوا میں نے کہا فرزند رسولؐ آپؑ نے کچھ آرام کرلیا ہوتا۔

امامؑ نے جواب دیا اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں روئے زمین پر مجھ سے اور میرے باپ سے بہتر کون ہے؟ راوی نے دریافت کیا وہ کون ہیں؟ فرمایا: رسولؐ اللہ اور امیر المومنینؑ اور میرے تمام آباء اپنے ہاتھ سے کام کرتے تھے اور یہ انبیاء، مرسلین اور اوصیاء وصالحین کا عمل ہے۔

(بحار الانوار ج ۱۱ ص ۱۶۶)

حلال امور کے لئے کوشش کرنا یا اسلامی اداروں کی خدمت، لوگوں کی ہدایت، ان کی تعلیمی وتربیتی امور کی ذمہ داری قبول کرنا مسلم انسان کی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ نبی یا امامؑ ہو یا ان کا تابع، ہاں اس حیثیت سے فرق ہے کہ رسولؐ اور امام کا علم لدنی ہوتا ہے، انہیں وحی والہام کے ذریعہ علم حاصل ہوتا ہے جبکہ فقہاء اور علماء کا علم اکتسابی ہوتا ہے، ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے حصول علم کے لئے پوری محنت وکوشش کریں اور اس کے بعد لوگوں کے ان امور کی ذمہ داری قبول کریں جن

میں مہارت رکھتے ہوں۔

واضح رہے کہ یہ افراد الگ سے ایسا کام نہیں کر سکتے کہ جس سے اپنی زندگی گذار سکیں اور آذوقہ فراہم کر سکیں تو پھر اسی ذمہ داری کی انجام دہی کے عوض مسلمانوں کے بیت المال سے ان کو اتنا دیا جائے کہ جس سے ان کے اخراجات پورے ہو سکیں یا وہ خود اپنی ضرورت بھر بیت المال سے پیسہ لے لیں، جیسا کہ بیت المال ہی کے پیسہ سے مدارس، مساجد، موسسہ خیریہ اور ان میں کام کرنے والوں کو بھی بیت المال ہی سے تنخواہ دی جاتی ہے۔

دوسری طرف جنگ و جہاد میں بھی شریک ہوتے تھے۔ تاریخ میں واضح الفاظ میں ہم یہ دیکھتے ہیں، وہ دوسرے مسلمانوں کی طرح بہادری کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتے تھے، یہاں تک کہ رسولؐ بہت سے معرکوں میں زخمی بھی ہوئے ہیں، جنگ احد میں تو آپؐ سے دفاع کرنے میں اگر علیؑ کی شجاعت و جوانمردی نہ ہوتی تو قریب تھا کہ آپؐ شہید ہو جاتے۔ (مناقب آل ابی طالب ج۱ ص ۵۹۲)

اور رسولؐ کے بعد خود حضرت علیؑ نے بھی اصلاحی اور دفاعی معرکوں میں شرکت کی ہے اور اسی طرح آپؑ کے فرزند امام حسنؑ نے اپنی برحق خلافت جس کو معاویہ بن ابی سفیان فریب و چالاکی سے ہڑپ کر لینا چاہتا تھا۔ سے دفاع کے سلسلہ میں جنگ کی۔ اسی طرح ہم امام حسینؑ کو دیکھتے ہیں آپ نے خود اور آپ کے اہل بیتؑ و انصار نے اموی سرکشوں سے جنگ کی اور دین حق پر اپنا خون بہانے کے لئے تیار ہو گئے۔

کیا امام علیؑ اور آپ کے دونوں فرزند، حسنؑ و حسینؑ کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ عیش و آرام سے اپنے گھر میں بیٹھے رہتے اور مشرکین، مفسدین کو معجزہ کے اسلحہ سے تباہ کر دیتے؟! انہوں نے خود کو اپنے اہل بیتؑ اور اصحاب کو جہاد و جانکاہی کی مشقت میں کیوں مبتلا کیا؟! کیا دین، خدا کا دین نہیں ہے، اسے آسمان سے لشکر بھیجنے چاہئیں اور معجزہ کے ذریعہ اپنے دین کی مدد کرنا چاہئے تاکہ نبی، اہل بیتؑ اور مسلمان ہر مصیبت اور مشقت سے امان میں رہیں؟!!

بعض لوگوں کی تو بڑی تمنا تھی کہ انبیاء اور ان کے اصحاب دونوں معرکہ سے دور بیٹھے رہتے اور اپنے آسمانی اعجاز کے ذریعہ اپنے دشمنوں کی شکست دیکھتے!

آپ جانتے ہیں جنگ احد میں رسولؐ کو اپنے چچا حمزہ کے شہید ہو جانے کا کتنا غم تھا۔ کیا آپؐ معجزہ سے کام لے کر اپنے چچا کو قتل ہونے سے نہیں بچا سکتے تھے، کیا انہیں دوبارہ زندہ نہیں کر سکتے تھے؟!

بلکہ جب تک معجزہ سے کام چلتا اس وقت تک کسی مشقت و جہاد اور جانفشانی میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں تھی

امام حسینؑ کے بعد ائمہؑ میں سے ہر ایک کو زہر سے شہید کیا گیا۔ زہر نے ان کے اندر کیوں اثر کیا؟ کیا وہ معجزہ سے زہر کے اثر کو ختم نہیں کر سکتے تھے؟

امام رضاؑ کو زہر دیا گیا اور آپؑ نے خود کو اس سے نہیں بچایا اور نہ ہی معجزہ کے ذریعہ ان اصحاب کو بچایا جنہیں حکومت و قوت پراگندہ کر رہی تھی جیسے دعبل خزاعی جس نے نصرت اہل بیتؑ میں اپنی پوری عمر گزاری تھی، جیسا کہ تاریخ

لکھتی ہے پچاس سال تک اپنی پھانسی کی لکڑی کو اٹھائے پھرتے رہے۔ امام رضاؑ کی خدمت میں پہونچے تو اپنا مشہور تائیہ قصیدہ پڑھا اور جب یہ شعر پڑھا:

**لقد خفت فی الدنیا و ایام سعیھا**

**و انی لا رجو الا من بعد وفاتی**

میں اس دنیا اور اس کی کوشش کے زمانہ میں ڈرتا رہا اور امید ہے کہ وفات کے بعد سکون میسر ہوگا۔

اس پر امام رضاؑ نے ان کے لئے دعا کی: خدا تمہیں روز قیامت امان میں رکھے گا۔

(اعیان الشیعہ ج۶ ص ۴۰۴۔ طبع دار المعارف بیروت)

کیا امامؑ آخرت سے قبل اس دنیا ہی میں ان کا خوف دور نہیں کر سکتے تھے؟ بالکل کر سکتے تھے لیکن یہ امان حیات میں جو سنت الٰہی ہوتی ہے اس کے خلاف ہوتی، اور انبیاء، ہمارے نبیؐ اور اہل بیتؑ بشر ہیں بس آسمان سے ان کی تائید ہوتی ہے وہ سنت الٰہیہ کے ساتھ چلتے ہیں امید اور تمناؤں کے ساتھ نہیں، آزمائش و ابتلا سنت الٰہی ہے بے پروائی سستی اور ناز و نخرا سنت نہیں ہے۔ بیشک انبیاء اور ان کے اوصیاءؑ ہمیں خدا کی سنتوں سے متعارف کرنے کے لئے آئے تھے نہ یہ کہ خود ان کی مخالفت کرتے جیسا کہ خدا فرماتا ہے:

**ام حسبتم ان تدخلوا الجنة و لما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستھم الباساء و الضراء وزلزلوا حتی یقولوا الرسول و الذین اٰمنوا معه متی نصر اللّٰہ الا ان نصر اللّٰہ قریب۔**

(بقرہ ۲۱۴)

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ آسانی سے جنت میں داخل ہو جاؤ گے جبکہ ابھی تمہارے سامنے پہلی امتوں کی مثال نہیں آئی ہے جنہیں فقر و فاقہ اور پریشانیوں نے گھیر لیا۔ اور اتنے جھٹکے دئے گئے کہ خود رسولؐ اور ان کے ساتھیوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ آخر خدائی مدد کب آئے گی۔ آگاہ ہو جاؤ خدا کی مدد بہت قریب ہے۔

رسولؐ اور آپؐ کے اہل بیتؑ میں سے ائمہؑ مسلمانوں کو خصوصاً ان لوگوں کو جو ان کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور ان سے محبت رکھتے ہیں، یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جنت کے راستہ کو عمل کرنے والے ہی طے کر سکتے ہیں اور عمل جتنا دشوار و تلخ ہوگا اتنا ہی پسندیدہ ہوگا۔

حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: سخت کوشی اور جانفشانی سے بلند درجات اور دائمی راحت حاصل ہوتی ہے۔

یہاں امام رضاؑ کے شاعر، دعبلؔ سے تعلق کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ ہمیں امام رضاؑ کے ان معجزات کا اذعان ہو جائے جو کہ ذمہ داری اور جنبش کے ساتھ مخلوط تھے۔ دعبلؔ کو امامؑ نے سو دینار ہدیہ دیئے، لیکن دعبلؔ نے مذکورہ رقم واپس کرتے ہوئے عرض کی کہ اس کے بجائے اپنے لباس میں سے کوئی لباس دیدیجئے تاکہ میں اپنے پاس بطور تبرک رکھوں۔ اس پر امام رضاؑ نے دیناروں کی تھیلی بھی دعبلؔ ہی کو دیدی اور جبّہ بھی دیدیا اور خادم سے کہا: ان سے کہدو کہ اسے لے لو عنقریب تمہارے کام آئے گا اسے واپس نہ کرنا۔

دعبلؔ اپنے قافلہ کے ساتھ شہر 'قم' کی طرف

روانہ ہوئے۔ راستہ میں ان پر راہزن ٹوٹ پڑے، قافلہ والوں کی مشکیں باندھ دیں اور سب مال و اسباب لوٹ کر آپس میں تقسیم کرنے لگے تو ان میں سے ایک نے بطور مثال کہا: میں ان کے اموال کو ان کے غیروں میں تقسیم ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ دعبل خزاعی نے اس سے کہا: یہ کس کی بیت ہے؟ اس نے کہا: خزاعہ میں سے ایک شخص کی ہے۔ دعبل نے اس سے کہا اس قصیدہ کا کہنا والا میں ہوں دعبل خزاعی، اس بات پر اس شخص نے ان کے اموال واپس لوٹا دیئے۔ دعبل وہاں سے روانہ ہو کر قم پہونچے اور اپنا قصیدہ تائیہ سنایا۔ قمیوں نے انہیں بہت زیادہ مال سے نوازا اور کہا: امام رضاؑ نے تمہیں جو جبہ دیا ہے اسے ہزار دینار میں ہمیں دیدو! دعبل نے انکا کر دیا اور وہاں سے چل دیئے راستہ میں ایک جوان نے دعبل سے وہ جبہ جھپٹ لیا۔ دعبل نے اہل قم سے کہا: جبہ واپس دیدو، انہوں نے کہا جبہ تو نہیں ملے گا اس کی قیمت ہزار دینار لے لو! کہا جبہ میں سے مجھے ایک ٹکڑا دیدو، انہوں نے دعبل کو ایک ٹکڑا واپس دے دیا۔

دعبل اپنے وطن کی طرف روانہ ہوئے جب گھر پہونچے تو دیکھا کہ گھر کا اثاثہ چوری ہو گیا ہے لہٰذا امام رضاؑ نے جو سو دینار عطا کئے تھے ان میں سے ایک، ایک سو دنیار کا فروخت کیا اس موقعہ پر انہیں امام رضاؑ کا قول یاد آیا کہ عنقریب تمہارے کام آئے گا۔

بس ہمیں حیات کو اسی طرح سمجھنا چاہئے جیسا کہ خدا نے اس آیت میں فرمایا ہے:

**کلاًنمدُ ھو لاء و ھو لا ء من عطاء ربک وما کان عطاء ربک محظوراً۔ انظر کیف فضلنا بعضھم علیٰ بعض وللاٰخرۃ اکبر درجات و اکبر تفضیلا**

(اسراء ۱۹۔۲۱)

ہم آپ کے پروردگار کی بخشش سے ان کی اور ان کی سب کی مدد کرتے ہیں اور آپ کے رب کی بخشش کا دروازہ کسی کے لئے بند نہیں ہے۔ دیکھئے ہم نے کس طرح بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور پھر آخرت کے فضیلت اور درجات اور زیادہ بڑے ہیں۔

اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے یہاں تک کہ انبیاء اور اولیاء بھی۔ بے شک زندگی عناصر خیر اور عناصر شر میں ٹکراؤ اور جنگ کا نام ہے اور پھر وسائل سب کے لئے بخشش ہیں، پس جو بھی زیادہ کوشش کرے گا اور سستی نہیں کرے اسے زیادہ سے زیادہ وسائل حاصل ہوں گے۔ اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ خیر کے لئے وسائل کو بروئے کار لاتا ہے یا شر کے لئے جیسا کہ اس سلسلہ میں مومن و کافر کے درمیان بھی کوئی فرق نہیں ہے۔

خدا نے اسی نہج پر حیات کو پیدا کیا ہے ارشاد ہے:

و لقد خلقنا الانسان فی کبد۔ (بلد۔ ۴)

ہم نے انسان کو مشقت میں رہنے والا پیدا کیا ہے۔　　(جاری)

**حدیث قدسی:-** اگر میرے بندوں میں سے وہ میری نافرمانی کرتا ہے جو مجھے پہچانتا ہے تو میں اس پر اسے مسلط کر دیتا ہوں جو مجھے نہیں پہچانتا ہے۔ (کافی)

# قصیدہ

## درمدح حضرت فاطمۂ زہرا صلوات اللہ علیہا

سید الادباء خطیب اعظم علامہ سید سبط حسن نقوی فاطر جائسی

مثال آئینہ ہوں دنگ حیرت کا ہے یہ نقشا
کدھر ہے فیض جاری کر دے میری طبع کو دریا

قلم طوبیٰ کا منگوا دے ورق خورشید کا لا دے
سیاہی میں مری حل کر سواد دیدۂ حورا

ورق خور کا سواد دیدۂ حورا جو پاجاؤں
دکھا دوں ہاتھ میں قرطاس لے کر نور کا تڑکا

کشش ایسی زمین صفحۂ قرطاس دکھلائے
اتر آئے فلک سے بن کے ذرہ کوکب زُہرا

شرف ہو بیسویں تاریخ کو کیونکر نہ عالم میں
ہوئی ہیں آج ہی پیدا جناب فاطمہ زہراؑ

نہ باقی تھا کوئی حصہ بھی مشرق میں نہ مغرب میں
ہوئیں مکہ میں گو پیدا مگر یہ نور تھا ہر جا!

ہر اک کی آنکھ خیرہ کرکے نور پاک کہتا تھا
کرو بند آنکھ اپنی میں ہوں نور فاطمہ زہراؑ

جناں سے آئیں دس حوریں بحکم حضرت باری
ہر اک کے ہاتھ میں ابریق و طشت جنت الماویٰ

لئے تھیں ساتھ آب طاہر سرچشمۂ جنت
جھلک سے آب کوثر کی ضیا بھی تھی تہ و بالا

ڈبوئے دیتی تھی گردوں کو موج اس کی تجلی کی
خدا کی شان اس کوزے میں در آیا تھا یہ دریا

یونہی چھلکے گا یہ پانی یونہی تڑپے گا اس کا دل
نہائے قرۃ العین نبی تب ہو جگر ٹھنڈا

زباں اس کی ثنا کیا کر سکے جس کی زیارت کو
جناں کو چھوڑ کر کوثر کا پانی خاک پر اترا

وہ مریمؑ جس کا بیٹا پیشوائے عیسیٰ مریمؑ
وہ بی بی آیۂ تطہیر جس کی شان میں آیا

وہ حورا جس کی خلقت باعث ایجاد جنت تھی
وہ حوا جس کا شوہر لائق تعظیم آدم تھا

اسی کی آسیہ کو آسماں سمجھی زمیں برسوں
اسی سے چرخ گردوں نے یہ گردش کا سبق کا سیکھا

نہ سکہ اس کی رفعت کا دلوں پر کس طرح بیٹھے
محمدؐ سا نبی جس کے لئے تعظیم کو اٹھا

وہ ماں جس نے تمامی عورتوں سے پہلے عالم میں
رسول حق کے ہاتھوں زیور اسلام و دیں پہنا

خدیجہ طاہرہؑ جس نے نباہی یوں پیمبرؐ سے
کہ اپنی زندگی بھر تو نہیں بھولے شہ والا

پدر وہ جس کے نام پاک سے کرسی کو زینت ہے
نگیں جس کا سلیماں سے سوا اقلیم میں نکلا

نوٹ:- علامہ نے یہ قصیدہ چودہ برس کی عمر میں کہا تھا۔

وہ زور آور کہ جس نے پشت گیتی پر کھڑے ہو کر
سپر کو بدرؔ کی انگشت کی تلوار سے کاٹا

شب معراج ہے جس کی ثنا کا اک لکھا دفتر
صباح گلشن فردوس جس کے نور کا جلوا

وہ شوہر نام جس کا مصحف ناطق ہے عالم میں
بحکم رب جو گھر میں حق کے قرآں کی طرح اترا

وہ گردوں آستاں، جس نے برائے طاعت یزداں
اشاروں میں نگہ کی طرح سے خورشید کو پھیرا

وہ بیٹے گوشوارے ہیں جو گوش عرش اعظم کے
وہ دُر ایسے جو دو ہونے پہ بھی تھے دہر میں یکتا

وہی سردار ٹھرے خلد کے سب نوجوانوں کے
نہ نکلا خلد میں کوئی حسینؑ ایسا حسنؑ ایسا

ہوئے دونوں امام اک فاطمہ کے شیر پینے سے
بیاض شیر میں شامل مگر نور امامت تھا

انہیں بیٹوں کی یہ ماں ہے میں جنکی مدح کرتا ہوں
یہ دونوں جس کے موتی ہیں وہیں کوثر ہے یہ دریا

جہاں میں آکے بھی جنت کے باشندوں میں شامل ہیں
جبھی تو مصطفیؐ فرماتے تھے انسیہؑ حورا

رسول اللہ کا انداز تھا بیٹی کے چلنے میں
جدھر سے خلق غافل تھی اسی جانب کو تھا سایا

فلک کے اوج کو نسبت ہے کیا زہراؑ کی رفعت سے
ہے گردوں سے کہیں اونچا نبی کی آنکھ کا تارا

ثنا بیٹی کی احمدؐ کر گئے جو بس وہی حق ہے
حجاب نور حائل ہے نظر آتا ہے مجھ کو کیا

سفینہ فکر کا ساحل تلک فاطرؔ نہ آئے گا
یہ کشتی روک بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

# قطعات

مولوی سید رضا محمد

اجمال نبوت کی تفصیل نہ ہو پاتی
احکام الٰہی کی تعمیل نہ ہو پاتی
شامل صف نسواں میں ہوتیں نہ اگر زہرا
تبلیغ رسالت کی تکمیل نہ ہو پاتی

---

یہ تو ظاہر ہے کہ تھیں احمدؐ کی دختر فاطمہؑ
غور کیجئے تو ملیں گی دیں کی رہبر فاطمہؑ
گہہ دعا سے گہہ ردا سے گہہ عمل گہہ صبر سے
عمر بھر کرتی رہیں کار پیمبرؐ فاطمہؑ

رضاؔ جائسی

یوں تو گھر بیٹھے ہی دیں ملنے کا دستور نہیں
ہاں مگر قدرت حق اس میں بھی مجبور نہیں
رہن ہو خانۂ شمعوں میں ردائے زہرا
کفر ایماں سے بدل جائے تو کچھ دور نہیں

---

کہئے تصدیق کا بہتر ہے یہ عنواں کہ نہیں
اب بھی مانے گا اسے مرد مسلماں کہ نہیں
جس کی لونڈی دے ہر اک بات کا قرآں سے جواب
بولئے اس کے گھرانے کا ہے قرآں کہ نہیں

# ظلِ ہما

لسان الشعراء سید مجاور حسین نقوی تمنّا جائسی

کتنی دلکش ہیں لب خیر النساء کی جنبشیں
کھنچ کے تامہد آگئیں موج ہوا کی جنبشیں

ہے خدیجہ کے مکاں کی آج رونق دیدنی
دیتی ہیں اس کا پتہ باد صبا کی جنبشیں

بیسویں تاریخ کو ماہ ششم کی سب ہیں محو
ارض کو سکتہ ہے زائل ہیں سما کی جنبشیں

شق ہوئی ہے دیکھتے ہی دیکھتے کوسوں زمیں
بڑھ گئی ہیں یوں رگ نشو و نما کی جنبشیں

یہ زمیں پر لکۂ ابر رواں کا عکس ہے
یا دم پرواز ہیں ظل ہما کی جنبشیں

ہے ہمیں بھی روئے زہرا کی مگس رانی کا شوق
باغ میں کہتی ہیں یہ شاخ حنا کی جنبشیں

جس طرح فرط خوشی سے بڑھتا ہے چہرے کا نور
بڑھ رہی ہیں اب یوں ہی موج ہوا کی جنبشیں

ابر تیرہ سے چمک ہے برق کی یہ آشکار
یا کسی کمسن کی چشم سرمہ سا کی جنبشیں

یوں شمیم خلد سے ہے چادر زہرا کو ربط
منحصر جیسے ہواؤں پر گھٹا کی جنبشیں

ہے ولادت آج اس بنت رسول اللہ کی
شاہد عصمت ہیں خود جس کی ردا کی جنبشیں

طفل غنچہ کو جھلا دے کیوں نہ جھولا شاخ گل
جب کریں اٹھکھیلیاں باد صبا کی جنبشیں

صحن گلشن میں یوں ہی کبک دری کی چال ہے
جیسے دلکش طائر قبلہ نما کی جنبشیں

خون بڑھنے سے یوں ہی ہے دل کی حرکت بھی فضول
ہوں عبث جیسے کسی بے دست و پا کی جنبشیں

حق نے خود بھی بھیجا تھا جس بی بی کو جنت کا طعام
کیسی تھیں اس کے لب معجز نما کی جنبشیں

شیر زہرا کی وہ قوت تھی لڑے جس سے حسین
ہیں گواہ اس کی بھی ارض کربلا کی جنبشیں

حشر میں فریاد امت لیکے آپ آئیں گی جب
قہر ہوں گی پایۂ عرش خدا کی جنبشیں

تھا اکھاڑا آپ کے شوہر نے جب خیبر کا در
کس غضب کے تھے وہ جھٹکے کس بلا کی جنبشیں

اس ولادت سے ہے پھیلا آج یوں مکہ میں نور
بن گئی ہیں بجلیاں موج ہوا کی جنبشیں

اب مسرت سے ہے یوں دریا لہو کا جوش زن
ہر رگ دل سے عیاں ہیں انتہا کی جنبشیں

مریم و کلثوم و سارہ اور جناب آسیہ
دیکھیں اب اس کے لب معجز نما کی جنبشیں

جس کی دایہ بننے کو بھیجا ہے خود حق نے انہیں
ہیں عبادت یعنی جس کے دست و پا کی جنبشیں

جس نے چکی پیس کر کی عمر اپنی سب تمام
ڈھونڈھتی ہیں جس کو ابتک آسیا کی جنبشیں

مختصر یہ ہے تمنّا جو کہ ہے بنت رسولؐ
بخشوالیں گی ہمیں اس کی ردا کی جنبشیں

# توقیر زہراؑ

سید قائم مہدی نقوی تذہیبؔ نگروروی

مہر و مہ سکتے میں ہیں تنویر زہرا دیکھ کر
سرنگوں ہے آسماں توقیر زہرا دیکھ کر

کہتے ہیں ام ابیہا اپنی بیٹی کو رسولؐ
انبیاء حیرت میں ہیں تقدیر زہرا دیکھ کر

عظمتوں کا کارواں لے کر چلی ہیں فاطمہ
خود رسالت اٹھ گئی توقیر زہرا دیکھ کر

یوں تحیر پر ملائک کے کہا جبریل نے
بھائیو! آیا ہوں میں تنویر زہرا دیکھ کر

آیۂ تطہیر کا بوسہ لیا آیات نے
پنجتن پر چادر تطہیر زہرا دیکھ کر

مطمئن ہے مذہب اسلام خوش انسانیت
کارہائے شبرؑ و شبیرؑ زہرا دیکھ کر

سارا عالم دنگ ہے خیرہ ہے چشم ارتقا
کربلا میں عظمت تعمیر زہرا دیکھ کر

فخر کی منزل میں ہے خود عظمت توحید بھی
زیر خنجر سجدۂ شبیر زہرا دیکھ کر

اک فدک کیا گلشن عالم ہے جاگیر بتولؑ
ناز ہے تذہیبؔ کو جاگیر زہرا دیکھ کر

## چادر زہراؑ

کہتے ہیں ام ابیہا خود رسولؐ
عظمت خاتون جنت دیکھئے
رحمۃ للعالمین پائے پناہ
چادر زہراؑ کی وسعت دیکھئے

## مدح امام خامسؑ

عمل سے تیرے اے فرزند عابدؑ
نبیؐ کا کام اچھا چل رہا ہے
چلایا سکۂ توحید تو نے
دلوں پر تیرا سکہ چل رہا ہے

## قطعہ

رضاؔ جائسی

جس کو جو چاہے وہ مخدومۂ دوراں دیدے
جس کی کہنہ سی ردا خلق کو ایماں دیدے
یہ تو گھر بیٹھے کا اعجاز ہے جا کر سر بزم
مردہ ہو جائے دلہن بھی تو اسے جاں دیدے

## قطعہ

شبیبؔ جائسی

منقبت کا شغل ہے کسب سعادت کے لئے
سیدہؑ کا ذکر ہے تحصیل عزت کے لئے
روشنی کا ہر بھکاری تیرے در تک آئے گا
تیرا گھر مخصوص ہے جلووں کی کثرت کے لئے

# بحضور امام ہمام جناب محمد باقر صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ

علامہ سید کلب احمد ماتی جائسی

ہے پسپا خوف مستقبل سے میری الفت آگینی
الٰہی سلب کر لے مجھ سے خوئے عاقبت بینی

ڈراتی ہے یہ کہہ کہہ کر مجھے انجام اندیشی
رہ الفت میں خون دل کی اک اک بوند ہے پینی

لہو بن کر دل آنکھوں سے بہے گلزار ہو دامن
اسی کو اصطلاح عشق میں کہتے ہیں رنگینی

کھٹکتی ہے محبت کی نظر میں عقل بھی جاں بھی
پسند اس کو ہے مجنوں شیوگی فرہاد آئینی

یہ لیجے ناصحِ مشفق نے بھی اک وعظ فرمایا
یہاں سے بھی ہوئی حاصل صلاح مصلحت بینی

مجھے دیوانگی تسلیم لیکن اس کو کیا کہیے
جو دیوانے سے رکھتا ہو امید حکمت آئینی

نہ کرنا جبہّ و دستار پر نازش کہ اے ناصح!
زیادہ سے زیادہ ہے یہ اک پوشاکِ تزئینی

تجھے مستقبل و انجام کا کیا علم اے واعظ!
یہ حکم حق سے وہ جانے جسے حاصل ہو حق بینی!

نبیؐ یا وارث علم نبیؐ جو مثل باقرؑ ہو
سوا اس کے نہ مکی جان سکتا ہے نہ قزوینی

سنا تو ہوگا حالِ باقرؑ علم نبی تونے
محمدؐ کی طرح حاصل تھی جس کو عصمت آئینی

یہ مطلع سن کے آفاقِ جہاں پر بھی نظر کر لے مطلع
کہ چھائی ہے شہیدان وفا کے خوں کی رنگینی

امامِ باقرؑ اللہ رے تری شبیّر آئینی
متاعِ دیں بڑے غارت گروں کے ہاتھ سے چھینی

شریک امتحاں جدو پدر کے ساتھ تو بھی تھا
ترا منھ دیکھتی ہے کربلا کی خدمت دینی

شدائد انتہا کے ابتدائے عمر میں جھیلے
تری شان رضا سے ہے خجل ایوب تمکینی

جہاں جو ہے وہیں واجب ہے اس پر بس تری بیعت
وہ غربی ہو کہ شرقی ہو، عراقی ہو کہ ہو چینی

جو ہو مقصود بزم آرائے ایماں تو لازم ہے
ترے گلزار علم و فضل سے کی جائے گل چینی

ہے ماتی بندۂ عاصی کہیں ایسا نہ ہو مولا
ڈبو دے یہ گنہ کا بوجھ یہ عصیاں کی سنگینی

برے کا بھی ہو بیڑا پار نیکوں کے تصدق میں
بچا لے غرق سے اے نا خدائے کشتی دینی

# قصیدہ

## در مدح آقائے دو عالم مولای و سیّدی حضرت امام محمد تقی علیہ السلام

علامہ سید کلب احمد ماتی جائسی

تمنا لائی ساحل تک سفینہ جان مضطر کا
دم آنکھوں میں ہے یا شوق نظر ہے زندگی بھر کا

رہے گی خلوتِ امروز دنیا میں جو محرومی
سہارا پھر تو بس ہے جلوت فردائے محشر کا

نظارے کی تمنا چاہتی ہے رو برو تم کو
نہ مانوں گا سر بالیں نقاب رخ اگر سرکا

جسارت ہو اگر یہ التجائے جلوہ فرمائی
تو اپنی ہی طرف رخ پھیر دو اس دیدہ تر کا

تمہارا اختیار نظم قدرت جانتا ہوں میں
نگاہوں میں ہے پھر جانا رخ مہر منور کا

تمہارے حکم میں ہے قوت حکم ید اللّٰہی
تمہارا اک اشارہ اور پھر جانا مقدر کا

امید موت سے تسکین پائی جیتے جی میں نے
یقیں اتنا تھا وقت واپسیں دیدار حیدرؑ کا

علیؑ ہی کا نہیں ان کے ہر اک فرزند کا جلوہ
سمجھتا ہوں کہ حصہ ہے نگاہوں کے مقدر کا

فدا ہو جان ماتی اے تقیؑ تم بھی تو آؤ گے
کہ آساں مرحلہ ہو جائے نزع روح مضطر کا

تم اے شاہ شہاں فرزند و وارث مرتضیٰ کے ہو
وہی رتبہ تمہارا جو تمہارے جد اطہر کا

کوئی مشکل نہیں مولا تمہارے واسطے مشکل
ابھی کھلتا ہے آجائے جو عقدہ فتح خیبر کا

جدارِ کعبہ، شاہا! راہ دے سکتی ہے تم کو بھی
مگر بے سود ہے اظہار اعجاز مکرر کا

زبان ابن اکثم گنگ حضرت کے تکلم سے
کوئی کیوں امتحاں لے وارثِ علم پیمبرؐ کا

طواف آستان مرتضیٰ مقصود خلقت ہے
وگر نہ کون سا مصرف ہے مہر و ماہ و اختر کا

پڑھوں مطلع کہ جس کی روشنی میں اہل حاجت کو
نظر آجائے مطلع آفتاب جودِ سرور کا

مطلع

جواد اک نام ہے معروف اس فرزند حیدرؑ کا
گدا کے دل کی ڈھارس یہ لقب ہے بندہ پرور کا

ترا اور خانوادے کا ترے مداح ہے ماتی
ترے بندوں کا بندہ ہے، بھکاری ہے ترے در کا

کہے تو کیا کہے شاہا، اگر مانگے تو کیا مانگے
تو حاوی ہے مصالح پر تو واقف ہے مقدر کا

مگر جو گنج قدرت میں ہے سب قبضے میں ہے تیرے
جو تو چاہے بھرے کاسہ گدائے مدح گستر کا

# مخمس

## درمدح امام عاشر حضرت علی نقی علیہ السلام

سید رئیس حسین نقوی عاصیؔ جائسی

(۱)

زباں سے کیسے کہیں ہم کہ دل ہے کاہش جاں
ہے دل تو ایک مگر دل میں لاکھ ہیں ارماں
یہ بات اور ہے فتنے کا ہے یہی ساماں
اسی میں راز محبت بھی ہوتا ہے پنہاں
یہی وہ دل ہے اٹھاتا ہے جو غم ہجراں

(۲)

کبھی تو کہتے ہیں اس دل کو ہم دل ویراں
کبھی یہ ہوتا ہے قسمت سے منزل جاناں
ہم اپنی جان کو اس پر نہ کیوں کریں قرباں
ذرا سی چیز اور اس کے ہزارہا خواہاں
نہیں شک اس میں کہ دل کا وسیع ہے داماں

(۳)

یہی وہ دل ہے جو خوف و رجا کا مسکن ہے
یہی وہ دل ہے جو مہر و وفا کا گلشن ہے
یہی وہ دل ہے جو حلم و حیا کا معدن ہے
یہی وہ دل ہے جو لطف و عطا کا مخزن ہے
اسی میں سارے جہاں کی ہے داستاں پنہاں

(۴)

اسی میں جذبۂ الفت کو موجزن پایا
اسی کا ہر عمل نیک و بد پہ ہے سایا
یہی ہے دین کا دنیا کا بھی یہ سرمایا
یہی ہے کعبے کا ہمسر اور اس کا ہمپایا
اسی میں معرفتِ حق کے راز ہیں پنہاں

(۵)

یہ جذب دل ہے جو مجھ کو مدینہ لے کے چلا
ہے رشک وادئ ایمن جہاں کا ہر ذرا
نبیؐ کے گھر میں محمد اک اور آج آیا
امام خلق جو ہے، ہے لقب نقیؑ جس کا
اسی سے پائے گا انساں تقرب یزداں

(۶)

یہ اس صدف کے گہر ہیں نہیں ہے جس کا جواب
یہ بحر جود و سخا کے ہیں گوہر نایاب
بجز نبیؐ کے ملے کس کو لعل یوں شب تاب
جہاں میں در سے انہیں کے کھلے علوم کے باب
نہ شہر علم بھی کس طرح ان پہ ہو نازاں

(۷)

فرشتے عرش سے آئے ہیں تہنیت دینے
نبیؐ کے لال پہ سب جان و دل سے ہیں صدقے
شرف حضوری کا قسمت سے مل گیا ہے جسے
زیارت آج امام دہمؑ کی کی اس نے
تقیؑ کی گود میں ہے آج پارۂ قرآں

(۸)

ہے جس کا تابع فرماں ہر ایک جن و بشر
جو آڑے وقت میں دین خدا کی ہوگا سپر
جو چین ہے دل مادر کا اور جان پدر
تقیؑ کے ہاتھوں پہ اس طرح ہے وہ نور نظر
کہ جیسے رحل پہ رکھا ہو پارۂ قرآں

(۹)

جسے ملا نہ کسی سے ہو کچھ وہی ترسے
ملا ہے ہم کو تو سب کچھ رسول کے گھر سے
نصیب ہو جو زیارت کبھی مقدر سے
لگائیں مرقد پرنور دیدۂ تر سے
ہے دل میں عاصیؔ ناشاد کے یہی ارماں

# مدح شفیعۂ حشر حضرت بنت پیمبرؐ

شاعر سفینہ جناب قاسم شبیر نقوی نصیر آبادی اعلی اللہ مقامہ

میرا مطلع عصمت تخئیل کی تحریر ہے
آیۂ تطہیر تو اک مطلع توقیر ہے
چار جانب اک حصار چادر تطہیر ہے
حیدرؑ و زہراؑ ہیں یوں اہل یقیں کے سامنے
ہے وہی حسنِ عمل حسنِ یقیں حسنِ نگاہ
ساری مائیں عالم اسلام کی اس پر نثار
تیری معصومی کے شاہد ہیں تیرے گیارہ پسر
خود رسول اللہ بھی اٹھیں تری تعظیم کو
تیرا ممنون دعا تھا اس کا انجام جہاد
چھاؤں میں ایمان کی امت رہیگی حشر تک
تیری سیرت کا تتمہ صبر زینبؑ کا کمال
اس میں ہیں تیری ریاضت کی منور آیتیں
یا شعاع نور سے کھینچی ہوئی تصویر ہے
جتنی تیری عمر ہے تطہیر ہی تطہیر ہے
تیرا پردہ غیرت اسلام کی تشہیر ہے
بولتے قرآں کی جیسے بولتی تفسیر ہے
فاطمہ پیغمبری کی دوسری تصویر ہے
مادر امت وہ ہے جو مادر شبیر ہے
تیری عصمت خود ہے آیت اور خود تفسیر ہے
یہ بلندی صنفِ نسواں کی نئی توقیر ہے
تجھ سے محو گفتگو جس ہاتھ کی شمشیر ہے
کتنی سایہ دار تیری چادرِ تطہیر ہے
تیری محنت کا نتیجہ محنت شبیر ہے
جو صحیفہ کربلا کی خاک پر تحریر ہے